گوشۂ خاص

بیاد

پروفیسر سیّد محمد سلیم

رحمۃ اللہ علیہ

تدوین و تحقیقِ مضامین

سیّد عزیز الرحمٰن

سیرت نگار

سیّد عزیز الرحمٰن

پروفیسر سیّد محمد سلیم رحمۃ اللہ علیہ

حیات و خدمات

خاندانی حالات

جعفری سادات کی ایک شاخ سلطان شہاب الدین غوری کے ساتھ نیشا پور سے ہندوستان آئی، اور ملتان میں قیام کیا، اس خاندانی کے مورثِ اعلیٰ سید عبدالرسول کو گڑگانویں میں قضاۃ کا منصب عطا ہوا، گڑگانویں کے قریب دہلی کے نواح میں ریواڑی ایک مشہور قصبہ ہے، یہ وہی قصبہ ہے جہاں خاندانِ غلاماں کا باجبروت بادشاہ بلبن جاگیردار رہ چکا تھا، نیز اکبر اعظم کا حریف بیوبقال بھی یہیں پیدا ہوا تھا، اسی مشہور قصبے میں پروفیسر سید محمد سلیم رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد قیام پذیر رہے۔

ریواڑی میں عہدِ اسلامی کے اوائل میں سادات کا ایک خاندان آباد تھا، جو امام جعفر صادق کے صاحبزادے علی عریضی کی نسل سے تھا، اس خاندان کو علاقے کی قضاۃ ملی ہوئی تھی، لیکن ۱۸۶۴ء قاضی ایکٹ کے تحت وہ ختم کردی گئی، اس خاندان کے ایک فرد قاضی سید کرم علی شاہ عالم بادشاہ کی طرف سے دہلی میں وکیل سلطنت تھے، انہیں کافی جائیداد ملی تھی، جس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا، قاضی کرم علی کے تین فرزند تھے، ۱۔ سید اشرف علی، ۲۔ سید ولایت علی، ۳۔ سید باقر علی، سید اشرف علی عربی و فارسی کے عالم فاضل اور شاعر تھے، نہایت خوشخط تھے، انہوں نے فارسی زبان میں چند کتابیں بھی تحریر کی تھیں۔ (۱)

پروفیسر صاحب کے پردادا قاضی سید اشرف علی نے خاندان میں سب سے پہلے طب کی تعلیم حاصل کی، ان کی شادی تجارہ ریاست الور میں ہوئی، اور وہ یہیں سکونت پذیر ہوئے، الور کے مہاراجہ نے آپ کی قابلیت سے متاثر ہوکر آپ کو تحصیلداری کا عہدہ پیش کیا، اسی وقت سے یہ خاندان مستقل طور پر تجارے میں آباد ہوگیا۔(۲)

قاضی سید اشرف علی کے دو فرزند تھے، ۱۔حکیم سید عبدالعزیز، ۲۔حکیم سید عبدالحمید، ان کے انتقال کے بعد (۳) حسب دستوران کے بڑے فرزند حکیم سید عبدالعزیز تحصیل دار مقرر ہوئے۔(۴) حکیم سید عبدالحمید نے بھی طب کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد تقریباً چالیس سال تک مہاراجہ الور شودان سنگھ کے ہاں شاہی طبیب کے منصب پر فائز رہے، مہاراجہ کے انتقال (۵) کے بعد واپس تجارے تشریف لے آئے، اور تقریباً ایک سال بعد ۱۹۰۱ء میں تجارے میں انتقال فرمایا۔(۶)

۱۳۰۵ھ میں حکیم سید عبدالحمید کے ہاں ان کے صاحبزادے عبدالوحید کی پیدائش ہوئی، یہی سید عبدالوحید پروفیسر سید محمد سلیم رحمۃ اللہ کے والد ماجد تھے۔(۷)

حکیم سید عبدالوحید نے ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی، مڈل کا امتحان تجارے ہی سے امتیازی پوزیشن میں پاس کیا، جس پر مہاراجہ نے خوش ہوکر قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ جو چارج سیل کا کیا ہوا تھا، مطبوعہ ۱۲۰۷ھ انعام میں دیا۔(۸) کم عمری ہی میں انہوں نے علاج شروع کر دیا تھا۔۱۹۱۰ء میں حمیدیہ دواخانہ قائم کیا، اس کی دوائیں دور دور تک جاتی تھیں، اسی دوران انہوں نے ملازمت بھی کی اور ۱۹۴۵ء میں ریٹائر ہوئے، حکیم عبدالوحید کا رجحان شروع ہی سے تصوف کی جانب تھا اور وہ ۳۰ر سال کی عمر میں میاں واجد علی شاہ مونگیلہ سے بیعت ہوکر سلسلۂ چشتیہ قادریہ سے منسلک ہوگئے، آپ کو ۴۵ء میں خلافت سے نوازا گیا مگر آپ نے سلسلہ آگے شروع نہیں کیا، تقسیم ہند کے بعد پاکستان آکر نواب شاہ میں سکونت پذیر ہوئے، اور ۲۷ جنوری ۶۸ء مطابق ۲۶ر شوال ۱۳۸۷ھ بروز ہفتہ کو انتقال فرمایا۔(۹) حکیم صاحب کے چار صاحبزادے تھے، ۱۔سید عبدالرشید، ۲۔سید عبدالمجید، ۳۔سید محمد سلیم، ۴۔سید عبدالرؤف، پروفیسر محمد سلیمؒ حکیم سید عبدالوحید کے تیسرے صاحبزادے تھے۔

ولادت

پروفیسر سید محمد سلیم رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق ۱۵؍دسمبر ۱۹۲۳ء کو ہوئی، لیکن پروفیسر صاحب کی اپنی تحریر کے بقول ان کی والدہ ماجدہ کے مطابق ان کی تاریخ ولادت ۲۸محرم الحرام ۱۳۴۱ھ ہے، جو ۲۲ستمبر ۱۹۲۲ء کے مطابق ہے۔(۱۰)

نام

آپ کا نام آپ کے ماموں قاضی عمادالدین نے عبدالسلیم رکھا تھا، یہی نام تمام اسناد میں درج ہے، بعد میں آپ کو جب علم ہوا کہ سلیم اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے نہیں ہے تو اسے بدل کر محمد سلیم رکھ لیا۔(۱۱)

تعلیم

آپ کی تعلیم کا آغاز دستور کے مطابق قرآن کریم سے ہوا، اور آپ کو حافظ عبدالصمد نابینا کے پاس بٹھایا گیا، قرآن شریف (ناظرہ) ختم کرنے کے بعد اسکول میں داخل ہوئے۔(۱۲)

غالباً ۱۹۳۱ء میں اسکول میں داخل ہوئے، ابتدائی درجے میں داخلہ ہوا، چند ماہ بعد امتحان پاس کرکے اول درجے میں آگئے، پہلی اور دوسری جماعت کا اکٹھے امتحان دیا، اور دوسرے سال میں تیسری جماعت میں داخل ہوگئے۔

تیسری جماعت میں اردو کا آغاز ہوا اور ساتویں جماعت سے فارسی شروع ہوگئی، اور ۱۹۳۸ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کرلیا۔اس سے اگلے سال ۱۹۳۹ء میں مولوی فاضل (عربی) کا امتحان بھی پنجاب یونیورسٹی سے پاس کرلیا۔(۱۳)

اس دوران اسکول کی تعلیم بھی جاری رہی، ۱۹۴۰ء میں میٹرک کا امتحان دیا، اور فرسٹ ڈویژن میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔(۱۴) ۱۹۴۲ء میں عربک کالج دہلی سے انٹرمیڈیٹ کا اور ۱۹۴۴ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۶ء میں وہاں سے ایم اے عربی کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ درجۂ اوّل میں پاس کرلیا، یونیورسٹی میں آپ کی تیسری پوزیشن تھی، اسی سال آپ نے ایل ایل بی کا مشکل امتحان بھی دیا اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کرلیا۔(۱۵)

اساتذہ

اس موقع پر مناسب ہے کہ آپ کے چند اساتذہ کا بھی تذکرہ کر دیا جائے، یوں تو آپ کے اساتذہ بہت سے ہیں، مگر چند اساتذہ کا آپ خاص اہتمام سے ذکر فرماتے تھے اور ان سے بہت متاثر تھے، ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ مولانا سید امتیاز علی مرحوم

تجارہ ریاست الور کا راجہ بڑا ظالم تھا، مسلمانوں کے لئے عربی، اردو، فارسی وغیرہ کی تعلیم بالکل ممنوع تھی، اور سنسکرت و ہندی لازمی تھی، ان مظالم کے خلاف مسلمانوں نے بغاوت کر دی، نتیجۃً انگریز حکومت نے اس راجہ کو معزول کر دیا، اور مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کر لئے گئے، جس کے بعد عربی و فارسی وغیرہ کی تعلیم شروع ہو گئی، یہ ۳۴ء کا قصہ ہے، اس کے بعد اردو و فارسی کی تعلیم کے لئے تجارے میں مولانا سید امتیاز علی آئے، ان ہی سے آپ نے فارسی کی تعلیم حاصل کی، پھر زائد اوقات میں مزید کتب پڑھائیں، اور اسی دوران منشی فاضل کی تیاری کروائی، اور ان ہی کی زیر نگرانی آپ نے ۳۹ء میں مولوی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔(۱۶)

۲۔ مولانا عبد العزیز میمن

پروفیسر سید محمد سلیم رحمہ اللہ کے اساتذہ میں مولانا عبد العزیز میمن جیسے عربی ادب کے فاضل و محقق اور معروف ترین فضلا بھی شامل ہیں، جن کا نام ہی ان کے علم و فضل کی دلیل ہے، آپ کا شمار مولانا کے خصوصی تلامذہ میں ہوتا تھا، آپ خود کہتے تھے کہ میرے اندر تحقیق کا ذوق مولانا ہی کا پیدا کردہ ہے۔(۱۷) آپ فرماتے ہیں کہ عربک کالج دہلی سے گریجویشن کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایم، اے، ایل ایل بی کرنے کے لئے گیا، وہاں میں نے عربی زبان میں ایم اے کیا، صدر مدرس مولانا عبد العزیز میمن تھے، جو اپنے شعبے میں شہرۂ آفاق تھے، مولانا چشمہ استعمال نہیں کرتے تھے، بجلی کا استعمال بھی ناپسند تھا، دن میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے، رات میں آرام کرتے تھے، بینائی سلامت تھی، دانت سلامت تھے، طویل سیر کے عادی اور صحت مند تھے، حافظے میں بڑی مہارت رکھتے تھے، ایک مرتبہ عرب ممالک میں گئے، بغداد کی

جامعہ گئے وہاں اساتذہ نے امتحان لینے کے لئے دریافت کیا کہ عباسی دور کا فوجی جنرل افشین تھا، یہ بہ زیر شین ہے یا بہ زبر شین، آپ نے جواب دیا کہ یہ حسنین کے وزن پر ہے اور ثبوت یہ دیا کہ معری نے اسے زین سے ہم قافیہ باندھا ہے، فوراً کتب خانے سے ''رسالۃ الغفران'' منگوا کر اسے ملاحظہ کیا گیا تو ان کی بات درست نکلی، مولانا کے حافظے کے واقعات بہت سے ہیں، عصر کے وقت سیر کرنے کے عادی تھے، میں ان کے ساتھ سیر پر چلا جاتا اور مختلف سوالات دریافت کرتا تھا، میں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔(۱۸)

۳۔ مرزا محمود بیگ

یہ علی گڑھ میں فلسفے کے استاد تھے اور کالج کے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے، پروفیسر صاحب کا اپنا بیان ہے کہ طلبا پر بڑے شفیق تھے، ہر نئی کلاس میں اعلان کرتے تھے کہ میں آپ کا بڑا بھائی ہوں، جو بات آپ اپنے والد سے نہیں کرسکتے وہ مجھ سے بیان کرسکتے ہیں اور عزتِ نفس و خودداری کو ابھارتے تھے اور کسی نے کبھی انہیں کسی لڑکے کو ڈراتے یا دھمکاتے ہوئے نہیں دیکھا، اس کے ساتھ ساتھ حد درجہ متحمل مزاج انسان تھے۔(۱۹) پروفیسر سّید محمد سلیم مرزا محمد بیگ سے بہت متاثر تھے، خود فرماتے ہیں۔ سب سے زیادہ جس استاد سے میں متاثر ہوا وہ مرزا محمود بیگ تھے۔(۲۰)

ہجرت

فروری ۱۹۴۷ء میں پروفیسر سید محمد سلیم رحمہ اللہ کی شادی ہوئی، ان کا سسرال بھوپال میں تھا، ۱۹۴۷ء کے وسط میں فرقہ وارانہ فسادات زور پکڑ چکے تھے اور اقلیتی علاقوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوگیا تھا، ۱۵/جولائی ۱۹۴۷ء کو آپ بھوپال گئے تو ۷/اگست کو ان کی غیر موجودگی میں تجارے میں ان کا گھر لوٹ لیا گیا، انہیں اخبارات کے ذریعے اس کا علم ہوا، لٹا پٹا خاندان دہلی میں موجود تھا، پروفیسر صاحب بھی دہلی پہنچے، اور سب کو لے کر بھوپال آ گئے، جب قیامِ پاکستان کا اعلان ہوا تو آپ تنہا بحری جہاز سے بمبئی کے راستے ۲۹/نومبر ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچے، ایک ماہ بعد خاندان کے باقی افراد بھی کراچی پہنچ گئے۔(۲۱) کراچی آئے تو سب خالی ہاتھ تھے، اس لئے یہاں آنے کے بعد کئی ماہ تنگیٔ حالات کا شکار رہے، پھر نواب شاہ میں آپ کے والد حکیم عبدالوحید نے حمید یہ دواخانہ قائم کیا جو بہت جلد مقبولِ عام ہوگیا۔(۲۲)

ملازمت

پروفیسر سید محمد سلیمؒ ۱۳؍جنوری ۱۹۴۸ء کو تنہا نواب شاہ پہنچے اور وہاں انہیں محکمۂ ریونیو میں ڈسٹرکٹ کی جگہ مل گئی، پھر ۲۶ جنوری کو وہ والدین اور دیگر افراد خانہ کو بھی وہیں لے آئے، وہ اس ملازمت سے مطمئن نہ ہوئے اور واپس کراچی آ گئے، یہاں انہیں ایس ایم کالج کے سامنے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی، تھوڑے عرصے کے بعد ۱۹۴۸ء میں آپ کو لیکچرر شپ مل گئی اور گورنمنٹ کالج حیدرآباد میں تعینات ہو گئے، ۱۹۴۹ء میں انہیں گورنمنٹ کالج شکارپور میں مقرر کیا گیا، وہ ۵۵ء تک وہاں قیام پذیر رہے ۵۶۔۵۵ء میں آپ کا تقرر گورنمنٹ کالج میرپور خاص میں اور ۵۷۔۵۶ء میں گورنمنٹ کالج نواب شاہ میں ہوا، ۳۱ اگست ۱۹۵۷ء کو سیاسی وجوہ کی بنا پر ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا، ۵۹۔۵۸ء کے دوران ایک پرائیویٹ ادارے اپر سندھ کالج جیکب آباد میں پروفیسر رہے، مگر بوجوہ یہاں سے بھی استعفیٰ دے دیا، ۱۹۶۰ء میں شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج (منصورہ) قائم کیا، اور اس کے پرنسپل رہے، لیکن ۱۹۷۳ء میں بھٹو حکومت نے جب تمام نجی تعلیمی ادارے قومی تحویل میں لینے کا ارادہ کیا تو یہ کالج بھی حکومتی تحویل میں چلا گیا، اور آپ پھر سے سرکاری ملازمت میں آ گئے، اور آپ کا تبادلہ شکارپور کر دیا گیا، اور ۱۵ دسمبر ۱۹۸۳ء کو ریٹائرمنٹ تک آپ وہیں مقیم رہے۔(۲۳) پھر ۸۴ء میں آپ ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، اور آخر تک اس حیثیت میں اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔(۲۴)

وفات

اس ماہر تعلیم، محقق و نقاد، سیرت نگار اور مؤرخ نے ۲۷ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو اسلام آباد میں داعی اجل کو لبیک کہا اور جان جاں آفریں کے سپرد کر دی، اور اگلے روز کراچی میں پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون!

عادات واخلاق

پروفیسر سید محمد سلیم رحمہ اللہ اخلاص وللہیت، صبر و استقامت، سادگی و انکساری، بردباری و تحمل، ایثار و جفاکشی میں اسلاف کی مثال تھے، توسنجیدگی و متانت، اخلاص و مروت، قوتِ حافظہ اور وسعتِ مطالعہ

کے لحاظ سے بھی سلفِ صالحین کا عملی نمونہ تھے، قحط الرجال کے اس دور میں آپ کا دم بہت سی وجوہ سے غنیمت تھا، سطورِ ذیل میں آپ کی عادات واخلاق کے چند گوشوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

لِلّٰہیت واخلاص

دیکھا جائے تو آپ کی سب سے بڑی خوبی آپ کا اخلاص وللّٰہیت تھی، آپ کی ساری زندگی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ مبارک انما الاعمال بالنیات (۲۵) (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) کی عملی تصویر تھی، آپ نے ساری زندگی یہی اصول رکھا کہ دنیا اور اہلِ دنیا سے نہ ستائش کی تمنا کی نہ صلے کی پروا، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپ کے اوقات میں برکت بھی خوب دی، آپ نے پوری زندگی میں اللہ کی رضا کو ہر ایک چیز پر مقدم جانا اور ہر عمل کامل اخلاص سے انجام دیا، آپ نے زندگی میں بیسیوں کتابیں اور سینکڑوں مضامین ومقالات تحریر کئے، مگر کبھی بھی ان سے ادنیٰ مالی منفعت کا خیال تک پیدا نہیں ہوا، جو کتاب جس نے اشاعت کے لئے مانگی اسے دے دی، حقوق تک اپنے پاس محفوظ نہ رکھے، بلکہ مضامین وکتب کی کاپی تک محفوظ نہیں رکھی، آپ کی اکثر کتب ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوئیں، جن سے کوئی مالی منفعت حاصل نہیں کی، آپ کا واحد مقصد علومِ دینیہ کا فروغ اور رضائے الٰہی کا حصول تھا، یہ وصف آپ کی تمام کتب میں نمایاں نظر آتا ہے، اپنی معرکۃ الآرا کتاب مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ میں حرفِ آغاز کے تحت یہ جملے اس دل سوزی سے تحریر فرمائے ہیں کہ ہر دردمند مسلمان اپنے آپ کو ان کا ہم آواز تصور کرتا ہے، لکھتے ہیں!

> پندرہویں صدی ہجری علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی آمد آمد کی تیاریاں ہو رہی ہیں، احقر بھی یہ حقیری پونجی ملتِ اسلامیہ کے حضور پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے، شاید یہ حقیری کوشش اسلام کی نہضت جدیدہ کے لئے معین ومددگار ثابت ہو جائے، شاید یہ حقیری محنت حضورِ بارگاہِ خداوندی میں شرفِ قبولیت حاصل کر لے۔ (۲۶)

اور ''اسلامی تعلیم بنیادی تصورات وافکار'' میں ''عرضِ مصنف'' کے تحت آخر میں ارقام فرماتے ہیں۔

> بندہ پروردگار کی کریمی سے امیدوار ہے کہ وہ اس حقیری کوشش کو قبول فرمائے اور اس کو اسلامی تصورِ تعلیم کے وسیع تر تعارف کا ذریعہ بنا دے، و بیدہ التوفیق۔ (۲۷)

ان سطور کے ذیل میں للّٰہیت و اخلاص کا پرتو ہر صاحبِ ذوق بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔(۲۸)

حافظہ

آپ کی ایک اہم خصوصیت آپ کی بے مثال قوتِ حافظہ تھی، آپ کا پسندیدہ مضمون تو تاریخ اور خصوصاً اسلامی تعلیم کی تاریخ تھی، مگر آپ سے کسی بھی اسلامی موضوع پر گفتگو ہوتی تو آپ دلائل اور حوالوں کے انبار لگا دیتے، حوالے بھی اس وضاحت سے اور برجستہ دیتے گویا کہ تحریر شدہ سامنے موجود ہیں، آخری ایام میں یہ قوت کسی قدر ضعف کا شکار تھی، مگر اس میں بھی ہم جیسوں سے کئی گنا زیادہ قوتِ حافظہ کا ثبوت دیتے تھے۔(۲۹)

آپ کی یہ بے مثال قوتِ حافظہ بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ آپ نہایت پاکیزہ صفت اور متدین شخص ہیں، کیونکہ امام شافعیؒ نے جب اپنے استاد وکیع رحمہ اللہ سے سوءِ حفظ کی شکایت کی تو انہوں نے یہی تلقین کی تھی، امام شافعیؒ کا شعر ہے۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی فارشدنی الیٰ ترک المعاصی

واخبرنی بان العلم نور ونور اللّٰہ لا یعطیٰ لعاصی

میں نے وکیعؒ سے اپنے کمزور حافظے کی شکایت کی، تو انہوں نے مجھے گناہوں کے ترک کرنے کی نصیحت کی،

اور مجھے بتایا کہ علم تو (اللہ کا) نور ہے اور نورِ خداوندی کسی گناہ گار کو نہیں دیا جاتا۔

اسی قوتِ حافظہ کے بل پر آپ نے بیسیوں کتب و مضامین تحریر کئے، اگرچہ بوقتِ ضرورت متعلقہ کتب کی طرف مراجعت کر لیتے تھے، مگر مضمون و کتاب کا خاکہ ذہن میں تیار ہو جاتا تھا اور انہیں معلوم ہوتا تھا کہ کونسی بات کس نے کہی ہے اور کہاں کہی ہے؟ ایک بار جو پڑھ لیتے وہ ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتا تھا، آپ کے صاحبزادے جناب ڈاکٹر سید عبدالمجیب کے بقول!

حافظہ غیر معمولی تھا، کتاب ایک دفعہ پڑھتے تھے تو پھر حافظے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی تھی، سنین کو اس طرح یاد رکھتے جس طرح آپریٹر فون نمبروں کو۔(۳۰)

تاریخ پر گہری نظر

اسی بے مثال قوتِ حافظہ ہی کی بنا پر تاریخ پر آپ کی گہری نظر تھی، یوں کہنا چاہئے کہ آپؒ کا خاص شعبہ تاریخ ہی تھا، مختلف مشاہیر کی تواریخ ولادت و وفات اس طرح یاد تھیں کہ حیرت ہوتی ہے، ان کی کسی بھی کتاب کا مطالعہ کیجئے، تاریخ آپ کو کتاب کے موضوع کے ساتھ ساتھ رواں دواں محسوس ہوگی۔(۳۱)

تاریخ سے پروفیسر صاحب کی دلچسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی اکثر، بیشتر کتب یا تو براہ راست تاریخ پر ہیں یا ان سے متعلق ہیں، یہاں تفصیل کا موقع نہیں، مضمون کے آخر میں مفصل کتابیات دی جارہی ہے، اس سے آپ کی خدمات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

سادگی

اس قدر علم و فضل کے ساتھ سادگی کا امتیازی وصف پروفیسر سیّد محمد سلیم رحمہ اللہ کو مزید نمایاں کرتا ہے، وہ علم و فضل کے جس بلند مقام پر تھے، اور ملک و بیرونِ ملک اطراف واکناف میں آپ کے جس کثرت سے شاگرد موجود تھے اس بنا پر کسی قسم کا اظہارِ تفاخر کچھ بعید نہیں تھا، مگر یہاں تو عالم ہی دوسرا تھا، ایک عالم آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا، اہل علم کی ایک بہت بڑی جماعت آپ کو اپنا استاد و مربی تصور کرتی تھی، ملک و بیرونِ ملک کے مشاہیر علما و فضلا سے ذاتی روابط تھے، مگر اس مردِ آزاد کو کسی صلے کی تمنا تھی نہ ستائش کی پروا، آپ داد و تحسین سے بے نیاز اور ہر طرح کے اعزازات و انعامات سے مستغنی، اپنے کام میں مصروف اور صحیح معنی میں ''فنا فی العلم'' تھے، یہ سچ ہے کہ وہ جس انداز کی شخصیت تھے اس کے شایانِ شان انہیں مقام نہیں مل سکا، نہ ان کی خدمات کی صحیح معنی میں پذیرائی ہی ہوئی، لیکن اس چیز نے انہیں کبھی رنجیدہ خاطر نہیں کیا، انہوں نے اس جانب کبھی توجہ ہی نہیں کی، اس لئے انہوں نے اس طرف نہ اشارتاً نہ کنایتاً اپنی گفتگو میں کبھی ذکر ہی کیا، وہ ان رسمی باتوں سے بہت بلند اور ان کی سوچ فانی اعزازات کی خواہش سے ماورا تھی، ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ جس کسی نے مطالبہ کیا اسے مضمون دے دیا، جس نے کتاب کی اشاعت کی خواہش ظاہر کی اسے کتاب تھما دی، اور مالی منفعت تو کبھی پیش نظر تھی ہی نہیں، مضمون کی کاپی تک محفوظ نہیں رکھی، جب بھی کسی موضوع پر گفتگو ہوتی تو سننے والے کو اس قدر مواد مل جاتا کہ اس پر اچھا خاصا مضمون تحریر ہوسکتا تھا، لیکن یہ سب گفتگو خالص علمی ہوتی اور ہر قسم کے اظہارِ تفاخر و تعلی سے یکسر پاک۔(۳۲)

آپ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ آپ کو کبھی بھی کھانے پینے کی کوئی پروا نہیں رہی، آپ کی خوراک

ہمیشہ سے سادہ ہوتی، شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ میں قیام کا واقعہ ہے جب آپ وہاں پرنسپل تھے، وہاں آپ طلبا کے ساتھ یکساں طور پر موسموں کی شدت برداشت کرتے ہوئے زندگی بسر کر رہے تھے، وہاں باہر کے طلباء اور اساتذہ کے لئے ہاسٹل کے مطبخ میں کھانا تیار ہوا کرتا تھا، آپ بھی وہی کھانا کھاتے، ایک روز طلبا جلی ہوئی روٹیوں کی شکایت کرنے آپ کی رہائش گاہ پہنچے تو آپ نے وہی جلی ہوئی روٹیاں دکھائیں اور فرمایا کہ میں بھی آج یہی روٹیاں کھا رہا ہوں، نتیجہ یہ ہوا کہ طلبا خاموشی کے ساتھ واپس ہو گئے۔ (۳۲ الف)

خالص متشرع زندگی

آپ کی خصوصیات علمی دنیا تک محدود نہیں تھیں، عمل کی دنیا میں بھی آپ بہت آگے تھے، آپ کا ہر قدم شریعت کے احکام کے تابع ہوتا، اور آپ کی تمام خوبیوں کا خلاصہ یہی تھا کہ ہر معاملے میں شریعت اور اسلام سے وابستگی کو اولیت دیتے تھے۔

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد پینشن وغیرہ لینے پہنچے تو ڈائریکٹر جانتے والا تھا، اسے صاف صاف کہہ دیا کہ میرا جو حق بنتا ہے صرف وہ مجھے دے دیا جائے، میں سود نہیں لوں گا، انہوں نے سمجھایا کہ یہاں پر رقم چھوڑنے سے کیا فائدہ؟ یہاں وصول کر لیں، پھر کسی ضرورت مند کو دے دیجئے گا، فرمایا آپ کی بات تو درست ہے مگر میں سود کی رقم کو ہاتھ بھی لگانا نہیں چاہتا، خود فرماتے تھے کہ گیارہ برس کی عمر میں نماز کی پابندی شروع کی تھی اور اس کے بعد یاد نہیں پڑتا کہ سفر و حضر میں کبھی کوئی نماز قضا ہوئی ہو۔ (۳۳)

جب آپ کا پراسٹیٹ (Prostate) کا آپریشن ہوا، تو آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر میں اسپتال میں بستر پر ہی مر گیا تو اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ اگر اس نے پوچھ لیا کہ تمہارے پڑوس میں افغانستان میں جہاد جاری تھا اس میں شرکت کیوں نہیں کی؟ تو کیا جواب دوں گا؟ خود فرماتے ہیں کہ میں نے وہیں نیت کر لی کہ صحت یاب ہونے کے بعد جہاد کی غرض سے افغانستان جاؤں گا، اسپتال سے فارغ ہونے کے کچھ عرصے کے بعد ایک قافلہ لاہور سے افغانستان جا رہا تھا، آپ نے فیصلہ کیا کہ آپ بھی اس قافلے کے ساتھ افغانستان جائیں گے، سب نے بہت روکا کہ ابھی آپ کا آپریشن ہوا ہے، جانا مناسب نہیں ہے، آپ نے فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ میں راستے میں مر جاؤں گا، لیکن یہ موت بھی

جہاد ہی کے راستے میں ہوگی، ان کے اصرار پر قافلے والوں نے انہیں شامل کرلیا، فرماتے ہیں کہ عجیب بات یہ تھی کہ دوران سفر جب تک پاکستان میں رہے دل میں موت کا خوف تھا، مگر جیسے ہی گاڑیاں افغانستان کی سرحد کے اندر داخل ہوئیں تو دل سے موت کا خوف بالکل ختم ہوگیا، جب ہم مجاہدین کے ہیڈ کوارٹر پہنچے جو ایک پہاڑ کے اندر غار میں تھا، عشا کی نماز ادا کی گئی، وہاں گھپ اندھیرا تھا، ایک لالٹین روشن تھی، جس کی ہلکی روشنی میں ہم بجلی کی روشنی کے عادی لوگوں کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، رات کا کھانا کھایا گیا، ایک روٹی کے چار حصے کر کے معلوم نہیں کس چیز سے کھانے کو دیئے گئے جو ہم نے ایک ایک ٹکڑا شکر الحمدللہ کہہ کر کھالیا، سونے کے لئے زمین پر ترپال بچھا ہوا تھا، میرے بڑھاپے کا خیال کر کے انہوں نے میرا بستر ایک اونچی جگہ لگایا، قریب جانے پر معلوم ہوا کہ یہ توپوں کے گولے ہیں، جن کو تہہ بہ تہہ رکھا ہوا ہے، تو یوں ہموں کے ڈھیر پر رات بھر امن سے سویا، غرض دوسرے روز میں نے کہا کہ بھائیو مجھے کوئی کام دو، تو انہوں نے ہلکے پھلکے کام میرے سپرد کر دیئے۔ (۳۴)

راہنمائی

وہ علمیت کے کسی خول میں بند نہیں تھے، سب کی رہنمائی کرتے اور مکمل معلومات فراہم کرتے تھے، (۳۵) راقم نے درس نظامی سے فراغت کے بعد بزرگوں کے مشورے پر پی ایچ ڈی کا ارادہ کیا تو بذریعہ خط آپ کو اطلاع دی، آپ نے اس سلسلے میں کئی خطوط تحریر فرمائے جن میں سے بعض محفوظ ہیں ان میں جہاں دینی اور عصری درس گاہوں کا فرق بیان کیا ہے وہیں عملی زندگی میں متحرک ہونے کی ترغیب بھی دی ہے اور وسعت مطالعہ کی جانب خصوصیت سے متوجہ کیا ہے، ان خطوط میں ایک جملہ تو ایسا ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے دینی مدارس اور عصری تعلیمی اداروں کے فرق کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا!

> ایک فرق ذہن میں رکھیئے، دینی مدارس میں عمق مطالعہ کو پسند کرتے ہیں اور انگریزی کالجوں میں وسعت مطالعہ کو پسند کرتے ہیں، اب آپ اپنے ذہن کا رجحان اور اپنے مطالعے کی بنا پر ایک دو تین عنوان طے کیجئے اور پھر یونیورسٹی کے استاد سے مل کر منظور کرایئے۔ (۳۶)

ایک خط میں راقم کو وسعت نظر کی جانب متوجہ کرتے ہوئے پی ایچ ڈی کے حوالے سے آمدہ مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

زندگی تجربات کا نام ہے، مختلف تجربات حاصل ہونے کے بعد ہی انسان کے اندر وسعت نظر اور ذہنی پختگی پیدا ہوتی ہے اب تک آپ نے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی، وہاں کا مزاج بالکل دوسرا ہوتا ہے، اب آپ جدید جامعہ میں گئے، یہاں بے نیازی اور عدم توجہی عام ہے، کسی ایک جامعہ کی خصوصیت نہیں ہے، جہاں جائیں گے یہی لیل و نہار ملیں گے، جب ان کی توجہ ہوگی تب بھی کافی دن آگے پیچھے ہونا پڑے گا یہ یہاں کی دنیا ہے۔ (۳۷)

مزید تحریر کیا:

دینی مدارس کے طالب علموں کو تحریر و کتابت کی مشق نہیں ہوتی ہے اس لئے آج کے دن سے روزانہ کسی نہ کسی موضوع پر صفحہ دو صفحہ کا مضمون لکھیں، اور ہفتے بھر کے بعد اس کی خود ہی اصلاح کریں، یعنی تحریر کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں، اردو کی ادبی معیاری کتابوں کو زیر مطالعہ رکھیں۔

ایک ضرورت یہ ہے کہ اپنی تحریر کا خط بھی زیادہ بہتر اور جاذب بنایئے تاکہ لوگوں کو پڑھنے کی طرف رغبت ہو، مقالے میں بہت سی خوبیاں درکار ہوتی ہیں۔

جب آپ نے ارادہ کرلیا ہے تو مستقل مزاجی کے ساتھ مشغول ہو جایئے، کم ہمتی کا اظہار نہ ہونے دیں، تلون مزاجی کا ثبوت نہ دیجئے۔ (۳۸)

اور ایک خط میں اس طرح تلقین کی،

اللہ تعالیٰ آپ کے شوق مطالعہ کو برقرار رکھے، دینی مدارس کے طلبا کا مطالعہ درسیات تک محدود ہوتا ہے آپ وسیع طور پر مطالعہ کریں۔ (۳۹)

اس خط کے ساتھ اپنی چند قیمتی کتب بھی ارسال کی تھیں۔

پروفیسر محمد سلیم صاحبؒ نے حوصلہ افزائی کرنے میں بھی کبھی بخل سے کام نہیں لیا، ایسے کتنے ہی واقعات ہیں جب نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی فرمائی اور انہیں آگے بڑھتے دیکھ کر خوشی محسوس کی، اسلاف کی یہ خصوصیت بھی جو ہم سے آج رخصت ہوتی جارہی ہے محترم ماما جان میں بدرجہ اتم موجود تھی، جس کی گواہی آپ کے قریبی ساتھی و متعلقین دیں گے، خود راقم کو ہمیشہ مطالعے کی تلقین کرتے انڈیا سے آپ کے قریبی دوست معروف مؤرخ، محقق عالم حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کی مقبول کتاب ''مسلمانوں کے ہر

طبقے اور ہر پیشے میں علم وعلما'' جب ان کی وفات کے بعد شائع ہو کر آپ کے پاس پہنچی تو مجھے فون کر کے بلوایا اور خاص طور پر عنایت کی، گزشتہ سال سیرت کانفرنس اسلام آباد میں احتساب کے موضوع پر راقم کے مقالے کو سندھ سے پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا تو حوصلہ افزائی کے لئے خود گھر تشریف لائے راقم نے اپنے مقالے کی ایک عکسی نقل انہیں پیش کی تو اسے اپنے پاس رکھ لیا اور فرمایا کہ میں گھر جا کر اس کا مطالعہ کروں گا، پھر اگلے روز ٹیلی فون آیا میں گھر میں نہیں تھا، تو ایک دن چھوڑ کر پھر فون کیا شاباش دی اور کہنے لگے کہ بہت محنت سے لکھا ہے، یہ سب حوصلہ افزائی کیلئے تھا ورنہ کہاں ان کا علم وفضل اور کہاں راقم آثم کا مضمونچہ۔(۴۰)

محترم جناب محمد موسیٰ بھٹو صاحب کو ایک خط میں آپ نے یہ ہدایات تحریر فرمائیں۔

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ انسان ضروری اور موزوں عملی اقدامات کرے۔ جاہد وفینا، زبانی جمع خرچ تک بات ختم نہ ہو جائے۔ محض دعاؤں اور تمناؤں تک بات ختم نہ ہو جائے۔ جو آج کل ہماری قوم کے اچھے بھلے لوگوں کا وطیرہ ہو گیا ہے۔ اللہ کی تائید اور ہدایت عملی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہے۔ دعاؤں کے ساتھ نہیں۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔

۲۔ انسان اپنی استعدادوں اور صلاحیتوں کی ساری پونجی راہ حق میں پیش کر دے اور مقدور بھر کوشش کرے، کوئی کسر نہ چھوڑے۔ بہت مدد آتی ہے۔ یہ مدت کبھی بڑھ جاتی ہے کبھی گھٹ جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ ۱۳ سال کی مدت تھی۔ جو مکہ میں بسر ہوئی۔ یہ آزمائش وابتلا کا دور تھا۔

اس مرحلے سے گزرنے کے لئے ثابت قدمی، صبر اور تعلق باللہ کی شدید ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''یہ اس نے اس لئے کیا ہے کہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔(مائدہ، ۴۸)''(۴۱)

یہاں مناسب ہوگا کہ آپ کے اس طریقہ کار کی وضاحت بھی کر دی جائے جس کو آپ مطالعے کے دوران اختیار فرماتے تھے۔ اور جو آپ کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا، کیونکہ یہ بات بھی عملی راہنمائی کے ذیل میں آتی ہے، آپ خود فرماتے ہیں کہ:

''میں مطالعے کے وقت رجسٹر ساتھ رکھ لیتا ہوں، جو کام کی بات نظر آئے وہ لکھ لیتا ہوں، کتاب کا نام بھی ساتھ ہی آ جاتا ہے، جب کبھی کوئی مضمون یا مقالہ لکھنے کا موقع ملتا ہے تو انہی رجسٹروں میں درج اقتباسات نقل کر دیتا ہوں، ضرورت پڑنے پر کتاب دوبارہ مہیا نہیں ہو سکتی۔'' (۴۲)

بہترین منتظم

ان تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ آپ عملی طور پر بھی سرگرم و متحرک رہے، اور اپنی صلاحیتوں کا بہترین ثبوت دیا، آپ کی انتظامی صلاحیتوں کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب آپ علی گڑھ میں بغرض تعلیم قیام پذیر تھے، یہ ۴۵۔۱۹۴۴ء کی بات ہے وہاں ایک انجمن ''مجلس اسلامیات'' کے نام سے قائم تھی، آپ اس کے سربراہ مقرر ہو گئے، اس کے تحت ہفتہ وار اجتماعات منعقد ہوتے تھے، مطالعے کے لئے کتب دی جاتی تھیں۔ (۴۳)

اور اس صلاحیت کا سب سے اہم مظاہرہ اس وقت ہوا جب آپ شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے، یہ کالج ۱۵/نومبر ۱۹۵۹ء کو قائم ہوا اور آپ اس کے پہلے پرنسپل تھے، اس کالج کا آغاز سات طلبا سے ہوا تھا، اور جب اسے ۷۲ء میں قومیایا گیا اس وقت اس میں ۳۵۰ طلبا مقیم تھے اور ان کے لئے ساڑھے چار من چاول پکتے تھے، اور بہت سے غیر ملکی طلبا مثلاً مالدیپ، افغانستان اور مارشیش کے طلبا بھی یہاں تعلیم پاتے تھے۔ (۴۴) آپ نے اسے اپنی محنت سے قابل قدر اداروں کی صف میں لا کھڑا کیا، آپ ہی کی محنت کے نتیجے میں وہاں دارالآثار قائم ہوا، جس میں بہت سے نوادرات آپ نے جمع کئے، اور آپ ہی کی ذاتی دلچسپی سے وہاں کی لائبریری میں ساڑھے چار سو کے قریب نادر قلمی مخطوطات جمع ہوئے۔ (۴۵) یہ کالج اپنی نوعیت کی منفرد درس گاہ تھی، جہاں طلبا کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی کردار سازی اور تعمیر سیرت پر بھی توجہ دی جاتی تھی۔ اور پروفیسر سید محمد سلیم رحمہ اللہ کی وسعت نظر، آفاقیت اور راست گوئی کی وجہ سے یہ ایک مثالی ادارہ بن گیا تھا، مختلف سازاور جغرافیائی اکائیوں کے مجمع کے باوجود کوئی جھگڑا یا بڑا اختلاف سننے میں نہیں آیا، آپ کی معصومانہ اور سلیم فطرت ہر اختلاف و نزاع پر قابو پا لیتی اور آپ کی رائے پر ہر فرد احترام سے سر جھکا لیتا تھا۔ (۴۶) اس کے علاوہ آپ بڑے عرصے تک ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان کے ڈائریکٹر بھی رہے اور آپ کی سرپرستی میں اس ادارے نے بہت اہم کتب شائع کیں،

جو آپ کی محنت اور صلاحیتوں کا بین ثبوت ہیں۔

انتھک محنت

آپ کے امتیازی اوصاف میں سے ایک وصف آپ کی انتھک محنت ہے، آپ کی پوری زندگی اس سے مزین ہے، آپ کی حیات کا غالب حصہ گھر سے باہر گزرا، جس کی وجہ سے آپ ہمیشہ آرام وسکون سے دور رہے، خصوصاً عمر کے آخری چند برسوں کے سوا عمر کے اس حصے میں بھی آپ گھر کا سکون وآرام نہیں پا سکے۔

آپ خود فرماتے تھے کہ میں نے ایم اے عربی کے دوران اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے تک مطالعہ کیا، حتیٰ کہ کثرتِ مطالعہ کے سبب میں بیمار ہوگیا، آپ کی یہی محنت تھی جس نے آپ کو ایم اے عربی میں فرسٹ ڈویژن دلائی، آپ کا یہ معمول آخری وقت تک جاری رہا، اور آپ آخری وقت تک صبح سے شام تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔(۴۷)

قناعت وبے نفسی

آپ نہایت بے لوث بے نفس اور بے غرض شخص تھے، آپ کو کبھی بھی دنیاوی معاملات سے اس حد تک دلچسپی نہیں رہی جو آپ کے علمی مشاغل میں حارج ہوتی، آپ کا سارا معاملہ قناعت وبے نفسی کے گرد گھومتا تھا، بقول پروفیسر عبدالحسیب احسن، جب تک آپ شکارپور رہے نہ آپ کا صندوق مقفل ہوتا تھا نہ ان کے کمرے کو تالا لگتا تھا، حالانکہ ان کے صندوق میں کپڑوں کے ساتھ پیسے بھی پڑے رہتے تھے۔ ان کی ہر چیز کھلی رہتی تھی، بلکہ انہیں تو یہ بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ ان کے صندوق میں یا ان کی جیب میں کتنے پیسے ہیں؟ آپ نے روپے پیسے سے ہمیشہ اپنے آپ کو آزاد رکھا۔ جب شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج کو قومیایا گیا اور آپ کا تبادلہ وہاں سے شکارپور کر دیا گیا تو یہاں محکمے نے ان سے ان کی سابقہ تنخواہ کے بارے میں رپورٹ طلب کی، آپ نے بڑی سادگی اور سچائی کے ساتھ وہی قلیل تنخواہ لکھ دی جو آپ مشنری جذبے کے تحت پرنسپل ہونے کے باوجود ادارے سے وصول کر رہے تھے، حالانکہ وہ تنخواہ ایک لیکچرار کی تنخواہ سے بھی آدھی تھی۔(۴۸)

جب ۸۴ء میں آپ لاہور منتقل ہوئے اور ادارہ تعلیمی تحقیق کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنے

فرائض انجام دینے لگے تو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم وتحقیق نے آپ کو پیشکش کی کہ روزانہ ایک پیریڈ لے لیا کریں، اس کے لئے وہ معقول معاوضہ دینے پر بھی تیار تھے۔ احباب نے کافی اصرار کیا کہ یہ پیشکش قبول کرلیں، مگر آپ نے صرف یہ فرمایا کہ:

''میں نے دل کو ٹٹولا، دل تیار نہیں ہوا۔ میں یہاں نوکری کرنے نہیں آیا ہوں، میں نے ثواب کی نیت سے رضائے الٰہی کی خاطر یہ سفر اختیار کیا ہے، اپنا ثواب ختم کرنا نہیں چاہتا، نوکری تو وہاں بھی مل ہی جاتی۔(۴۹)

آپ کی فنائیت اور بے نفسی کے بارے میں محمد موسیٰ بھٹو تحریر کرتے ہیں۔

اسلامی فکر، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کے مطالعے میں فنائیت کی وجہ سے ان کی طبیعت میں سادگی، درویشی، بے نیازی، بڑے پن سے دستبرداری، مقصد کے لئے زندگی وقف کرنے کا جنون اور زندگی کی لذتوں سے دستبرداری جیسی صفات بدرجہ اتم پیدا ہوگئی ہیں، میری نظر میں پروفیسر محمد سلیم صاحب پہلی شخصیت ہیں، جن کی زندگی کو کتابوں سے عشق نے پاکیزہ نصب العین کی زندگی میں تبدیل کیا ہے۔ ممکن ہے اس میں ان کی خاندانی تربیت اور فطرت سلیمہ کو بھی عمل دخل حاصل ہو۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جوں جوں علم، مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ بڑھتا ہے، فرد میں اپنی شخصیت کا زعم پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس کی عزت وتکریم میں کمی ہو تو وہ شدید احساسات کا شکار ہوجاتا ہے نیز وہ معاشرے کے لئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنے داخلی تضادات اور نفسی قوتوں کے غلبے کی وجہ سے ایسا فکر دیتا ہے، جس سے معاشرے میں تفرقہ اور تفریق پیدا ہونے لگتی ہے۔ لیکن پروفیسر محمد سلیم صاحب کی شخصیت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف پر اللہ کا یہ بڑا فیضان ہے کہ وسیع مطالعے اور غیر معمولی ذہانت کے باوجود ان کے اندر اپنے عجز اور چھوٹے پن کا احساس موجود ہے، انہوں نے کبھی بھی نمایاں ہونے اور ساتھیوں کے حلقے اور معاشرے میں حیثیت ملنے کی آرزو اور کوشش نہیں کی۔ جس ادارے میں کام کیا، وہاں کی انتظامیہ کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا۔ بلکہ ان کے لئے خیر وبرکت کا باعث بنے۔ پروفیسر محمد سلیم صاحب کی اس طرح کی ادائیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ معاشرے میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں۔(۵۰)

وسعتِ مطالعہ

آپ کے نمایاں اوصاف میں وسعتِ مطالعہ اور شوقِ مطالعہ سرِفہرست ہے، آپ نے ایک بار اپنا ایک خواب بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

> میں نے بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ درمیان میں میں خود ہوں اور میرے چاروں طرف کتابیں ہیں، اور میں انہیں ذوق وشوق کے ساتھ پڑھ رہا ہوں، وہی اثر آج تک میری طبیعت پر ہے۔(۵۱)

حقیقت یہ ہے کہ اس خواب کو آپ نے مسلسل مطالعہ اور پیہم تعلیمی وعلمی انہماک کے ذریعے سچی و عملی تعبیر میں تبدیل کر ڈالا، آپ کا پسندیدہ مشغلہ مطالعہ اور آپ کا پسندیدہ موضوع کتابیں تھیں، خواہ کسی موضوع پر ہوں اور کسی کی بھی تحریر کردہ ہوں، آپ جس کتاب کا مطالعہ شروع کرتے اسے اول سے آخر تک پڑھ ڈالتے، آپ کو اردو، عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا، اس بنا پر آپ کے مطالعے کا افق اور وسیع ہوگیا تھا، جس نے آپ کی تالیفات میں بھی وسعت پیدا کردی، اور آپ کے ہاں مواد کی جو کثرت نظر آتی ہے اس کا سبب بھی یہی تھا، اور اسی بنا پر آپ کی کتب میں جہاں اردو اور عربی کے حوالے نظر آتے ہیں وہیں فارسی و انگریزی کتابیات کی بھی ایک طویل فہرست دکھائی دیتی ہے۔

دوام فی العمل

آپ کی کامیابی کا ایک راز یہ تھا کہ آپ کے عمل میں دوام اور معمولات میں پختگی پائی جاتی تھی، آپ لگے بندھے معمولات کی پوری پابندی فرماتے تھے، نتیجتاً آپ کے کھانے پینے، آرام وعبادت اور لکھنے پڑھنے کے اوقات متعین تھے، آپ اپنے وقت کو پورے طے شدہ نظام الاوقات کے ساتھ صرف کرتے تھے، جس کے سبب آپ کے اوقات میں اللہ تعالیٰ نے برکت بھی رکھی تھی، اور اسی بنا پر آپ سے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا کام لیا اور آپ نے اتنا عظیم تحریری سرمایہ چھوڑا ہے۔

وسعتِ نظر

آپ اپنے واضح نظریات رکھنے کے باوجود نہایت وسعتِ نظر کے حامل تھے، اور ہر طرح کے طبقات ہائے فکر سے یکساں تعلقات تھے، اور ہر اہلِ علم کی ان کے دل میں بڑی قدر تھی، اگر اختلاف کی نوبت آتی تو اختلاف کرتے مگر دلیل کے ساتھ اور مکمل احترام ملحوظ رکھتے ہوئے، مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، مولانا عبدالرشید نعمانیؒ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں مدظلہم، حکیم محمود احمد برکاتی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ یہ وہ اصحاب ہیں جن سے آپ کے براہ راست تعلقات اور خط و کتابت رہی، اور اس سلسلے کے کثیر تعداد میں خطوط دستیاب بھی ہوئے ہیں اور الحمدللہ محفوظ ہیں، آپ ان سب کی علمیت سے متاثر تھے اور سب کا تذکرہ اچھے الفاظ میں فرماتے تھے۔

انکساری

پروفیسر سید محمد سلیم رحمہ اللہ جہاں علم و تقویٰ میں اسلاف کا عملی نمونہ تھے، وہیں سادگی ملنساری و انکساری و خاکساری میں بھی اسلاف کی سچی تصویر تھے، جس طرح پھل دار درخت کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ جھک جاتا ہے، اسی طرح علم کی بھی شان یہی ہے کہ وہ انکساری پیدا کرتا ہے اور خوشہ چینی کرنے والوں کی سہولت کے لئے وہ اپنی شاخیں جھکا لیتا ہے۔ آپ کے معاملے میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے، اس قدر علم و فضل اور وسیع مطالعے کے ساتھ جس نے آپ کو اپنے موقف پر اعتماد، اپنے علم و معلومات پر بھروسا اور اپنے خیالات پر مکمل شرح صدر عطا کر دیا تھا، آپ نے اپنے کسی قول و فعل سے کبھی ایسے عمل یا ردِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا جس سے اظہارِ تفاخر ہوتا ہو، ہمیشہ اس قدر انکساری سے کام لیتے کہ آپ کی خوشہ چینی کرنے والے بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگتے، آپ صحیح معنی میں فنا فی العلم اور سچے عالم تھے، جن کا علم خشیتِ الٰہی میں اضافے کا موجب بنتا ہے، اور جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ (۵۲)

بلاشبہ اللہ سے، اس کے بندوں میں سے علما ہی ڈرتے ہیں۔

اسلوبِ تحریر

آگے بڑھنے اور آپ کی خدمات کا تذکرہ کرنے سے قبل مناسب ہے کہ آپ کے اسلوبِ تحریر کے حوالے سے بھی چند پہلو پیش کریں، ویسے بھی اسلوبِ تحریر عادات ہی کا حصہ تصور کیا جاتا ہے، اور انسان کی خصوصیات میں سے ہے۔ آپ کی اسلوبی وتحریری خصوصیات کو چند عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ سادہ و عام فہم اسلوب، ۲۔ اختصار کے ساتھ جامعیت، ۳۔ انداز غیر معذرت خواہانہ، اور دوٹوک، ۴۔ بے لاگ، طرزِ تحریر، ۵۔ اشعار کا برمحل استعمال۔

اب ان عنوانات پر مختصراً روشنی ڈالی جاتی ہے۔

سادہ و عام فہم اسلوب

آپ کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ بالکل سادہ، عام فہم اور لفاظی سے یکسر پاک ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی طبعی سادگی اپ کے اسلوب پر بھی اثر انداز ہوئی اور اس سے آپ کی تحریر زیادہ عام فہم ہوگئی اور اس کے ابلاغ کا دائرہ کار مزید بڑھ گیا، انسان کے لئے تعلیم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

> تعلیم اسلام کے نزدیک انسان کے لئے اس قدر ضروری ہے جس قدر خورد ونوش، خوراک کے ذریعے انسان زندگی برقرار رکھتا ہے، تعلیم کے ذریعے انسان حیوانیت کی سطح سے بلند ہوکر انسان کے درجے پر پہنچ جاتا ہے، تعلیم انسان کو بتاتی ہے کہ وہ نرا حیوان نہیں ہے، بلکہ اشرف المخلوقات ہے، خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، انسان کا کام صرف مادی اور حیوانی دریا میں شناوری کرنا نہیں ہے، بلکہ انسان کا اول کام اخلاقی اور روحانی فضاؤں میں پرواز کرنا ہے۔ (۵۳)

ایک مقام پر مسجد کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

> اول روز سے تعلیم وتدریس سے اسلام کا رابطہ ہے، مکہ کے ناسازگار ماحول میں دارارقم میں اسلام کا اولین مدرسہ قائم ہوا، یہ مخفی مدرسہ تھا، جب مدینہ میں آزاد فضا میسر آئی

اور اللہ کی عبادت کا پہلا گھر مسجد نبوی ﷺ تعمیر ہوا، تو ساتھ ہی تعلیم کا پہلا مرکز صفہ بھی تعمیر ہوا، اس طرح تعلیم کا اور مسجد کا تلازمہ ہوگیا، پھر جہاں جہاں دنیا میں مسلمان گئے وہاں مساجد تعمیر کیں اور ان کے ساتھ مدارس بھی کھل گئے، نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم ہے، اس لئے مسلمان گلی گلی محلہ محلہ مساجد تعمیر کرتے تھے۔(۵۴)

۲۔ اختصار کے ساتھ جامعیت

آپ کے اسلوب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ جملے مختصر ہوتے ہیں، اور یہ مختصر جملے ایک دوسرے سے مل کر مربوط عبارت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، لیکن اس اختصار کے ساتھ جامعیت اس قدر ہوتی ہے کہ چند جملوں میں پورے پورے مضامین سمو دیتے ہیں، گویا کہ دریا کو کوزے میں بند کر دینے کی مثال صادق آتی ہے، اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ عام طور پر آپ کے ایک مضمون میں اس قدر مواد ہوتا ہے کہ اسے پھیلا کر کتابی شکل دی جا سکتی ہے، چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

اسلامی تہذیب کی بابت تحریر فرماتے ہیں!

اسلامی تہذیب یک تخمی بہار ہے، یہ دوسروں سے مستعار کوئی تالیفی مجموعہ نہیں ہے، اسلامی تہذیب کی اساس دین اسلام ہے، یہ کسی انسانی ذہن کا ساختہ دین نہیں ہے، اس کی اساس وحی الٰہی پر ہے، یہ دین اور یہ تہذیب دراصل وحی الٰہی اور ہدایت الٰہی کے پیدا کردہ اور پروردہ ہیں۔(۵۵)

عقل کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ہندوستان میں صدیوں تک شوہر کی موت کے بعد بیوی کو زندہ رہنے کے حق سے محروم کیا جاتا رہا، شوہر کی لاش کے ساتھ اس کو زندہ جلایا جاتا رہا، طبقہ اچھوت کو انسانیت کے مرتبے سے محروم رکھا جاتا رہا، یونان میں ارسطو جیسا فلسفی عورتوں اور غلاموں کو انسان سے فروتر درجہ دیتا ہے، بدھ مت کے زیر اثر ہندوستان میں اور کیتھولک مذہب کے زیر اثر یورپ میں، ازدواجی تعلقات کو گندگی قرار دیا گیا، جس سے اجتناب ضروری تھا، یہ فیصلے صدیوں نافذ رہے، کسی خردمند نے ان کے خلاف زبان نہیں ہلائی، حالانکہ آج بالاتفاق مشرق ومغرب کے حکما اور دانشوران افعال کو غلط اور معاشرت

کے لئے مہلک قرار دیتے ہیں، گویا عقل نے صدیوں ٹھوکر کھائی۔(۵۶)

۳۔ دوٹوک اور غیر معذرت خواہانہ انداز

مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب تلاش کرتے ہوئے مفکرین و دانشوروں نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، بعض نے اگر ان کے تمام مزعومات کو اسلامی الاصل قرار دے کر ان کے اثبات کے لئے قرآن و حدیث کو مشقِ تاویل کا نشانہ بنا ڈالا تو بعض نے یہ کوشش کی کہ اسلام پر عائد الزامات کا جواب دینے کے لئے بعض مسلمات کا ہی انکار کر دیا، یا تاریخی واقعات و حقائق کی دور از کار تاویلات کرنے پر مجبور ہو گئے، اس ساری مشق کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ مغرب کے عقلا کے سامنے ذہنی مرعوبیت کا شکار تھے اور ان کی رائے کو حرفِ آخر تصور کر کے اس پر صاد کہتے تھے، ایسے میں کچھ مفکرین و فضلا ایسے بھی تھے جنہوں نے اسلامی تعلیمات کے مقابلے میں کوئی دوسری رائے اختیار نہیں کی، اور کسی مرعوبیت کا شکار ہوئے بغیر اپنا ما فی الضمیر پیش کیا، پروفیسر سید محمد سلیمؒ کے ہاں بھی یہی اسلوب نظر آتا ہے، ان کا انداز قطعاً غیر معذرت خواہانہ ہے، مثال کے طور پر مغربی مفکرین کی ایک غلطی کی جانب تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں!

> مغربی معاشرے کے معمار حکما اور فلاسفہ نے بھی انسان کی حقیقت کے متعلق غلط نظریات قائم کر کے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور انسانی معاشروں کو بھی گمراہی کے غاروں میں دھکیل دیا، جس کے نتائج بد سے آج مغربی معاشرہ بری طرح پریشان ہے، جس سے آج ہر چشم بینا واقف ہے۔(۵۷)

مزید لکھتے ہیں!

> جب مغربی مفکرین کے نزدیک انسان شرارت کا پتلا ٹھہرا تو انسانی معاشرہ بھی لامحالہ شرارت سے پر ہوگا، شرافت اور انسانیت وہاں کیسے پروان چڑھ سکتی ہے؟ مسلۂ ارتقا کے زیر اثر انسان کو نرا حیوان قرار دے کر اہلِ مغرب نے انسانیت پر بہت بڑا ظلم ڈھایا ہے، مغربی نظامِ حیات کو اس تصور نے بری طرح مجروح کیا ہے، یہ فسادِ فکر و نظر مغربی معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے، اس کے زہر سے مغربی تہذیب کی روح اندر ہی اندر گھلتی چلی جا رہی ہے۔ ظاہری خیرہ کن چمک کے باوجود یہ تہذیب رو بہ زوال ہے۔(۵۸)

۴۔ بے لاگ طرزِ تحریر

اس کے ساتھ ساتھ انداز تحریر بے لاگ بھی تھا، جس بات پر آپ کو یقین ہوتا اور جسے درست سمجھتے اسے کہنے پر باک نہ ہوتا تھا، نہ کسی مصلحت سے کام لیتے تھے، آپ علی گڑھ کے فیض یافتہ تھے، آپ نے اعلیٰ تعلیم وہیں سے حاصل کی، مگر جب ''تاریخ نظریۂ پاکستان'' مرتب کرنے کی ذمے داری سنبھالی تو بڑے سادہ لفظوں میں یہ حقیقت تحریر کر دی:

> ہندوستان کے مسلمان معاشرے میں مغربیت کا سیلاب علی گڑھ کالج قائم ہو جانے کے بعد آیا ہے، اس لئے بجا طور پر اس کو ہی ذمے دار ٹھہرایا جاتا ہے۔(۵۹)

مزید لکھتے ہیں!

> علی گڑھ کالج اور اسی قبیل کے دوسرے اسلامیہ کالجوں میں پڑھ کر مسلمانوں کی ایسی نسل تیار ہوئی جو اپنے اسلاف سے فکر و عمل میں یکسر مختلف ہے، انہوں نے انگریزی حکومت کے تیار کردہ سانچے (Frame Work) میں تربیت پائی ہے۔(۶۰)

لیکن سرسید کے اچھے کارناموں کی بھی دوٹوک حمایت کی، سرسید نے مسلمانوں کی کانگریس میں شرکت کی مخالفت کی تھی، آپ اس کی تفصیل تحریر کرنے کے بعد ذکر کرتے ہیں!

> سرسید کی مخالفت کرنے سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ مسلمان ہندو لیڈروں کے زیر قیادت آنے سے بچ گئے، ہندو قوم میں ضم ہونے سے بچ گئے، مسلمانوں کی انفرادیت بہر کیف برقرار رہی، ان کا انفرادی تشخص محفوظ رہا، اور یہ کوئی کم فائدہ نہیں ہے۔(۶۱)

۵۔ اشعار کا برمحل استعمال

آپ کے اسلوبِ تحریر کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی تحریر میں برمحل اشعار کا استعمال بہت عمدہ طریقے سے ملتا ہے، اس سے آپ کے وسیع ادبی مطالعے اور بلند ادبی ذوق کا بھی اظہار ہوتا ہے، بعض مقامات پر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اشعار گویا کہ کہے ہی اس موقع کے لئے گئے ہیں، یہ پیرا ملاحظہ کیجئے، کس خوبی سے برمحل شعر استعمال ہوا ہے۔

> جدید دور میں بت پرستی اگر ختم نہیں ہو گئی تو بے اثر ضرور ہو گئی ہے، شرک اور بت پرستی

کی جگہ اب کفر والحاد نے لے لی ہے۔ آج جمہوریت کا دور دورہ ہے، جمہوریت اور علوم کی حکمرانی کے پس پردہ ایک مخصوص گروہ حکمران بن جاتا ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری (۶۲)

ایک اور عبارت میں شعر کا موزوں استعمال دیکھئے!

ماورائے طبعیات ایک اور عالم بھی ہے، جس کو مذہب کی زبان میں عالمِ غیب کہتے ہیں، انسانی ڈرامے کا وسطی حصہ ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے، آغاز اور انجام ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔

سنی حکایت تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم (۶۳)

اور اس پیرے میں مناسبتِ شعر ملاحظہ کیجئے!

انسانی ذہن کی وسعتیں لامحدود ہیں، اس لئے وہ بہر دم، بہر طور اور بہر رنگ ایک نئی دنیا تعمیر کرنے میں منہمک رہتا ہے، انسان ہرگز زمانے کا محکوم نہیں ہے، بلکہ وہ زمانے کا حاکم ہے۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر (۶۴)

خدمات

آپ کی خدمات کا دائرہ متنوع بھی ہے اور وسیع بھی، اس میں کئی ایک پہلو زیادہ نمایاں ہیں، ذیل میں ان چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے، ۱۔ سیاسی تحریکوں میں شرکت، ۲۔ تدریسی خدمات، ۳۔ تصنیف و تالیف، ۴۔ مضامین، ۵۔ تقاریر و لیکچرز، ۶۔ خدماتِ سیرت۔

سیاسی تحریکوں میں شرکت

زمانہ طالب علمی سے اہم قومی و سیاسی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ۲۳/ مارچ ۱۹۴۰ء

آنے تک علیحدہ وطن کا تصور مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن چکا تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور تو اس علیحدہ وطن، پاکستان، کے حصول کے عزم کا محض اعلان تھا۔ قرارداد پاکستان کو حقیقت بنانے کے لئے قائداعظمؒ کے حکم سے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے مسلمان طلبہ میدان عمل میں اتر چکے تھے۔ پروفیسر سید محمد سلیم ابتدا ہی سے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن دہلی کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں مسلم لیگ کونسل کی اس میٹنگ میں شرکت کی جس میں یمن پر برطانوی حملے کی مذمت کی قرارداد پاس ہوئی تھی۔ پروفیسر سید محمد سلیم نے ۱۹۴۲ء میں امداد حسین اور ہنگرامی کے ساتھ مل کر کام کیا۔ یہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے قائدین تھے۔ جب ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس عرب کالج دہلی کے ہال میں منعقد ہوا تو اس وقت وہ اسی کالج میں بی۔اے کے طالب علم تھے۔ ۲۵ اکتوبر سے لے کر ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء تک مسلمان علما کا ایک چار روزہ اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں جمعیت علما ہند کے مقابلے میں جمعیت علما پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا عبدالرؤف داناپوری، پیر صاحب آستوئی اور دوسرے علما اس اجلاس میں شریک تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک وفد اس میں شریک ہوا جس میں ڈاکٹر افضال حسین قادری، امیرالدین ایڈووکیٹ بارہ بنکوی، مولانا عبدالقیوم، نیز مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور پروفیسر سید محمد سلیم شریک تھے۔ اس زمانے میں پروفیسر صاحب علی گڑھ یونیورسٹی میں مجلس اسلامیات کے صدر تھے اور وہ اپنی اس حیثیت میں طلبہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ پروفیسر صاحب کے تعلقات ڈاکٹر سید عبدالجبار خیری سے بھی قائم ہو چکے تھے۔ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ان کی علمی شخصیت سے استفادہ کرتے رہے۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر سید عبدالجبار خیری وہ عظیم عالم تھے جنہوں نے سب سے پہلے کوپن ہیگن کی ایک کانفرنس میں تقسیم ہند کا نظریہ پیش کیا تھا۔ یہ مطالبہ ہندو مسلم دو قومی نظریہ کی بنیاد پر تھا۔

مارچ ۱۹۴۶ء میں وہ مشہور زمانہ الیکشن ہندوستان میں ہوا جس کی وجہ سے ہندوستان دو حصوں، پاکستان اور بھارت، میں تقسیم ہوا۔ مسلم لیگ نے اپنی پوری قوت اس اہم انتخاب میں لگادی۔ قائداعظم نے منظر عالم گوالیاری کو علی گڑھ یونیورسٹی بھیجا تاکہ وہ طلبہ کو قومی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کرنے پر آمادہ کرے، قائداعظم کے حکم پر یونیورسٹی کے ہزاروں طلبہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئے، چار چار پانچ پانچ طلبہ کی ٹیمیں بنا کر شہر شہر، قریہ قریہ بھیجا گیا۔ اندازہ ہے کہ تقریباً ۱۴ ہزار طلبہ نے اس قومی مہم میں حصہ لیا۔

پروفیسر سید محمد سلیم ایک وفد لے کر رہتک پہنچے جہاں سے مسلم لیگ کی طرف سے راؤ خورشید علی خان الیکشن لڑ رہے تھے۔ پروفیسر صاحب اپنے ساتھیوں کو لے کر گاؤں گاؤں پہنچے اور مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مسلم لیگ کو ووٹ دیں۔ اسی زمانے میں انہیں اس تلخ حقیقت کا پتہ چلا کہ جاٹوں کے علاقے میں مسلمانوں کو نیا مسجد بنانے کی اجازت تھی اور نہ ہی انہیں اذان دینے کی اجازت تھی۔ یہ الیکشن راؤ خورشید علی خان جیت گئے۔ پروفیسر سید محمد سلیم مسلم لیگ کے اس کنونشن میں بھی علی گڑھ یونیورسٹی سے آ کر شریک ہوئے تھے۔ جو ۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو عربک کالج دہلی کے چمن میں منعقد ہوا تھا، اور جس میں مسلم لیگیوں نے سرکاری خطابات واپس کئے تھے اور پاکستان حاصل کرنے کا عزم راسخ کیا تھا۔ مسلم لیگ کے ساتھ ان کا یہ ذہنی اور عملی تعلق قیام پاکستان تک برقرار رہا۔ (۶۵)

آپ ۱۹۴۰ء میں جماعتِ اسلامی سے متاثر ہو چکے تھے جس کا سبب ترجمان القرآن کا مطالعہ بنا۔ (۶۶) اس کے بعد قیام پاکستان ہوا۔ یہاں آپ جماعتِ اسلامی سے باقاعدہ منسلک ہو گئے، پھر تنظیم اساتذہ پاکستان کے صدر، سندھ کے صدر، اور سندھ کے نائب صدر کے عہدوں پر فائز رہے، مگر اب ایک طویل عرصے سے عملی سرگرمیوں سے لاتعلق اور صرف لکھنے پڑھنے تک محدود تھے، اور عمر کا آخری حصہ آپ نے صرف لکھنے پڑھنے خصوصاً اسلامی نظامِ تعلیم کی صورت گری میں صرف کیا، آپ نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس مقصد کے لئے وقف کر دیا تھا۔ (۶۷)

تدریسی خدمات

آپ بنیادی طور پر ایک استاد تھے، اور آپ نے اس حیثیت کو ہر صورت میں برقرار رکھا، آپ کی باضابطہ تدریس کی مدت ۳۵ سال بنتی ہے، لیکن آپ سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے، اور ہر دور میں بلکہ آخری لمحوں تک یہ استفادہ جاری رہا، آپ کے تدریسی دور کا تذکرہ ملازمت کے احوال میں درج ہو چکا ہے۔

تصنیف و تالیف

آپ کا خاص میدان تصنیف و تالیف ہی تھا، یا یوں کہہ لیں کہ آپ کے اصل جوہر اسی میدان میں کھلے، آپ بنیادی طور پر مؤرخ تھے، لیکن ایک استاد کی حیثیت سے اور اسلام کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی

کے سبب آپ کی دلچسپیاں اسلامی تعلیم کے ساتھ رہیں، مگر آپ کا قلم مختلف جہتوں میں سرگرم رہا، آپ کی تحریری خدمات کو موضوعات کے اعتبار سے ان عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔قرآنیات، ۲۔سیرت، ۳۔تاریخ، ۴۔تعلیم، ۵۔خط و املا، ۶۔تنقید بر افکارِ مغرب، ۷۔زبان و ادب، ۸۔شاعری،

یہاں زیادہ تفصیل کا تو موقع نہیں، آخرِ مضمون میں مفصل کتابیات دی جا رہی ہے، جو ان تمام موضوعات پر مشتمل ہے، اور سیرت پر خدمات کا جائزہ سطورِ ذیل میں الگ عنوان کے تحت آئے گا، ان شا اللہ، صرف شاعری کے حوالے سے چند باتیں پیش کرنا ضروری ہیں۔

شاعری

آپ کی تصنیفی و تالیفی حیثیت اس قدر مسلم ہے کہ اس پہلو کے تحت آپ کی دیگر خدمات نمایاں نہیں رہیں، لیکن آپ کی شاعری اس کا حصہ ہونے کے باوجود قارئین کے سامنے نہیں آ سکی، اور عوام تو عوام خواص بھی اس سے لاعلم نظر آتے ہیں، اس وقت راقم کے سامنے آپ کا کلام موجود نہیں ہے، ورنہ اس کے نمونے پیش کیے جاتے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ نے شاعری کی ہے، جس کا کچھ حصہ اب تک محفوظ بھی ہے، نواب شاہ میں قیام کے دوران بہت سے ادبی ذوق رکھنے والے افراد جمع ہو گئے تھے، جن کی موجودی میں ادبی اجتماعات ہوتے، اس میں آپ بھی شرکت فرمایا کرتے تھے، اور آخر میں اس مجلس میں پیش کیے جانے والے تازہ کلام، افسانوں اور مقالات کا آپ تنقیدی جائزہ لیتے تھے۔(۶۸)

مضامین

کتب کے علاوہ آپ نے بے شمار مضامین تحریر کیے، جن کے موضوعات تقریباً وہی ہیں جو کتب کے سلسلے میں بیان ہو چکے ہیں، ان کی حتمی تعداد کے بارے میں فی الوقت کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ ان کی تعداد کئی سو ہے، جن میں سے ایک بڑی تعداد ایسے مضامین کی ہے جو اب تک شائع نہیں ہوئے، آپ کے مضامین، ترجمان القرآن، افکارِ معلم، زندگی، جسارت، تکبیر، ایشیا وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں، اور کچھ مضامین ماہنامہ تعمیرِ افکار میں بھی شائع ہوئے ہیں، لیکن سب سے زیادہ آپ نے افکارِ معلم کے لئے لکھا ہے۔اور مارچ ۸۹ء سے دسمبر ۹۶ء تک آپ کے افکارِ معلم میں ۷۶ مضامین شائع ہوئے۔(۶۹)

اس کے علاوہ آپ کی اپنی تحریر میں بھی آپ کے طبع شدہ مضامین کی فہرستیں ملی ہیں، جن کے مطابق ۸۴ء سے قبل آپ کے ۱۵/مضامین شائع ہوئے، ۸۶ء میں ۱۷/اور ۸۷ء میں ۱۵/شائع ہوئے، ان میں بھی صرف تعلیم کے حوالے سے آپ کے مضامین کی تعداد اس طرح ہے۔

۸۴ء ۴مضامین

۷۵ء ۳ //

۸۶ء ۱۷ //، جبکہ یہ مضامین اوپر ذکر ہونے والی تعداد کے علاوہ ہیں۔

لیکن بعض اشارے ایسے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تعداد حتمی نہیں ہے، جہاں تک آپ کے غیر مطبوعہ مضامین کی تعداد کا تعلق ہے تو اس کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے صرف ان مضامین کی تعداد جو آپ نے ۹۵ء میں لکھے اور وہ شائع نہیں ہوئے، ۵۳ ہے۔

تقاریر و لیکچرز

اس کے علاوہ آپ نے بڑی تعداد میں تقاریر کیں، دروس دیے، لیکچرز دیے، ان کی حتمی تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے، البتہ اس کے کچھ اشارے ان نوٹس سے ملتے ہیں جو آپ کے کاغذات سے دستیاب ہوئے ہیں، نیز آپ کے کچھ لیکچرز و خطبات بعض حضرات کے پاس کیسٹس کی شکل میں موجود ہیں، مثال کے طور پر پروفیسر نور ورجان نے ابھی اس جانب توجہ دلائی ہے کہ ان کے پاس کچھ تقاریر اور کافی درسِ قرآن موجود ہیں۔ (۷۰) ضرورت اس بات کی ہے کہ جن حضرات کے پاس اس قسم کی کیسٹس موجود ہیں وہ آگے آئیں اور اس بارے میں معلومات فراہم کریں، تاکہ ان کی حفاظت اور بعد ازاں اشاعت کے لئے عملی اقدامات کئے جا سکیں۔

خدماتِ سیرت

پروفیسر سید محمد سلیم رحمہ اللہ کی خدماتِ سیرت کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس پہلو پر ہیں یا زیادہ تر اس پہلو کے گرد گھومتی ہیں جس پر ہمارے ہاں خصوصاً اردو میں اس سے قبل بہت کم لکھا گیا تھا، آپ نے جن شعبوں کو خصوصیت سے منتخب کیا ان میں عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ ﷺ کا تصورِ تعلیم اور آپ ﷺ کا طریق تعلیم و تربیت ہے۔ اس کے علاوہ فنونِ لطیفہ اور سیرتِ طیبہ کے تعلق پر بھی آپ نے کافی

وقیع کام کیا ہے، ذیل میں آپ کی ان کتابوں اور مضامین کا ذکر کیا جاتا ہے جو سیرتِ طیبہ یا اس سے متعلقہ موضوعات و مباحث پر مشتمل ہیں، یا ان کا کچھ حصہ ان مباحث پر ہے، اس کے بعد ان میں سے چند اہم کتب و مضامین کا جائزہ لیا جائے گا،

۱۔ ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم، اس میں دوسرا باب اسلامی نظامِ تعلیم کی خصوصیات، تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے۔ از ص ۲۷ تا ص ۶۲۔(۷۱)

۲۔ عہدِ اسلامی کے عظیم مدارس، اس میں اسلامی تعلیم کے حوالے سے چند مباحث از ص ۵ تا ۱۴ اور پھر مسجدِ نبوی ﷺ کا ذکر ہے، از ص ۱۷ تا ۱۸۔(۷۲)

۳۔ قومیت و وطنیت، اس مختصر کتاب میں تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں اسلام کا تصورِ قومیت واضح کیا گیا ہے۔(۷۳)

۴۔ تاریخ نظریۂ پاکستان، اس کا پہلا باب تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے۔(۷۴)

۵۔ اسلام کا نظامِ تعلیم، عہدِ رسالت، عہدِ خلافتِ راشدہ، عہدِ بنی امیہ۔(۷۵)

۶۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم، پہلی صدی ہجری میں۔(۷۶)

۷۔ اسلامی تعلیم بنیادی تصورات و افکار، پوری کتاب کے مباحث قرآن و حدیث سے مستنبط ہیں۔(۷۷)

۸۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ تعلیمی۔(۷۸)

۹۔ داعیِ اعظم ﷺ اور کثرتِ ازواج۔(۷۹)

۱۰۔ حدود اللہ کا نفاذ شرفِ انسانیت کا تحفظ ہے، یہ کتاب بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں تحریر کی گئی ہے۔(۸۰)

۱۱۔ حجِ بیت اللہ، بصارت و بصیرت۔(۸۱)

۱۲۔ عورت، حیثیت، خاندان، کردار اور تعلیم، پوری کتاب قرآن و سنت کی روشنی میں تحریر کی گئی ہے۔(۸۲)

۱۳۔ اسلامی زندگی۔

۱۴۔ تاریخ خط و خطاطین، اس میں دو باب تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں تحریر کیے گئے ہیں۔(۸۳)

۱۵۔ اسلام کا نظریہ تعلیم، یہ بعد میں اسلامی تعلیم بنیادی تصورات و افکار کا حصہ بن گئی۔

۱۶۔ طبقۂ نسواں کا محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم۔

☆ چند ان کتب کا ذکر بھی ذیل میں کیا جاتا ہے جو غیر مطبوعہ ہیں، اور مباحثِ سیرت پر مشتمل ہیں۔

۱۷۔ اسلامی نظامِ تعلیم کی حکمت و غایات۔

۱۸۔ اسلام کا فلسفہ تعلیم، جہانی نقطۂ نظر، تصورِ کائنات و تصورِ انسانی۔

۱۹۔ خلیفہ فی الارض،

۲۰۔ خلافتِ تمکین، خلافتِ عبودیت۔

۲۱۔ اسلامی معاشرے میں قیادت و سیادت،

مضامین

۱۔ کفار سے مشابہت کیوں ممنوع ہے؟(۸۴)

۲۔ اسلام کا فلسفہ تعلیم۔(۸۵)

۳۔ رمضان المبارک، تعلیم و تربیت۔(۵۶)

۴۔ ناموسِ رسالت ﷺ پر جان کا نذرانہ پیش کرنے والے جاں نثار۔(۸۷)

۵۔ اسلامی فنونِ لطیفہ،(۸۸)

۶۔ مغربی افکار اور اسلامی افکار میں فرق۔(۸۹)

۷۔ علم کی اہمیت۔(۹۰)

۸۔ شادی کی اہمیت اسلام میں۔(۹۱)

۹۔ ادارۂ خلافتِ راشدہ کی بعض خصوصیات۔(۹۱)

۱۰۔ سیرتِ طیبہ اور فنونِ لطیفہ۔(۹۳)

۱۱۔ مسلمانوں کا ذوقِ کتاب داری۔(۹۴)

اس کے علاوہ اور بہت سے مضامین آپ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں ایسے ہیں جو براہ راست سیرتِ طیبہ کے موضوع پر ہیں یا ان کا سیرت طیبہ سے تعلق ہے۔ان میں سے پانچ مضامین السیر ہ کی اسی اشاعت اور اسی گوشۂ خاص میں شامل ہیں۔

اب ہم آپ کی چند اہم کتب و مضامین کے مندرجات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اسلام کا نظامِ تعلیم

آپ کی یہ کتاب بے حد اہمیت کی حامل ہے،اس میں مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کا عہد بہ عہد جائزہ لیا گیا ہے،یہ کتاب نفس مضمون کے اعتبار سے تین حصوں پر مشتمل ہے،عہد رسالت،عہد خلافتِ راشدہ، عہد بنی امیہ،اور آخری دونوں عہد بھی ،خصوصاً عہدِ خلافتِ راشدہ چونکہ عہد رسالت ہی کا پرتو ہیں اس لئے یہ تقریباً مکمل طور پر مباحث سیرت پر مشتمل ہے، پہلے حصے کے اہم مندرجات یہ ہیں،عرب قبل از اسلام، مکی دور دارِ ارقم ابن ابی ارقمؓ،لازمی تعلیم، مدنی دور،علم کی فضیلت و اہمیت ، مسجد کی اہمیت ، مدرسہ صفہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تدریس، تعلیمی تحریک، مسجد (مدرسہ) کی فضیلت،علم کی فضیلت،طریقۂ فہمائش، مقاصدِ تعلیم و نصاب، دینی علوم،فقہ کی تعلیم ،دعوت،طریق تدریس و تربیت، دنیاوی علوم، ناپسندیدہ علوم، صنعت و حرفت، جسمانی تربیت، اخلاقی تربیت، خواتین کی تعلیم، بچوں کی تعلیم،صفائی کی تعلیم، آداب کی تعلیم، اشاعتِ تعلیم و تدریس، تعلیمی تحریک کی کامیابی، ان مباحث سے ہی کتاب کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، آپ وجہ تحریر اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

> ''بلاشبہ ایک نظامِ تعلیم اول روز سے چلا آ رہا ہے،ایک دن کا بھی انقطاع واقع نہیں ہوا، مگر نصوصِ تعلیم بہ طرز نصوص احکام مرتب نہ ہو سکے، آج جب ہم اغیار کے ذہنی اور فکری تسلط میں زندگی گزار رہے ہیں، ہم فکری انتشار میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ہمیں حق و باطل کی تمیز نہیں رہی، ہم نے اغیار کا نظامِ تعلیم قبول کر لیا ہے، ہم نے اپنی تعلیمی روایات سے بے گانگی اختیار کر لی ہے،اور ہمیں اس میں نہ شرم ہے اور نہ غیرت،تو آج نصوص او ر احکام متعلق تعلیم مرتب کرنے کی ضرورت ہے''۔(۹۵)

اسلامی تعلیم ،بنیادی تصورات وافکار

یہ دراصل مجموعۂ مقالات ہے، اور بعض مضامین، قرآنِ کریم کی روشنی میں تحریر کیے گئے ہیں، لیکن کئی ایک مضامین سیرتِ طیبہ اور تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں بھی تحریر کیے گئے ہیں، مثال کے طور پر، ا۔تعلیم برائے عظمتِ الٰہی، ۲۔اسلام کا تصورِ تعلیم، ۳۔اسلام کا نظریہ تعلیم، ۴۔اسلامی نظامِ تعلیم کا مقصد، ۵۔اسلام کے تعلیمی انقلاب کا پیغام، ۶۔اسلام کا طریق تربیت، ان میں آخری مقالہ کافی اہمیت رکھتا ہے، اس مقالے پر آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق تربیت کو ان عنوانات کے تحت بیان کیا ہے۔ ا۔تعلیم، ۲۔وعظ و ارشاد، ۳۔طریقہ محبت، ۴۔طریقہ فضیلت، ۵۔طریقہ حکمت، ۶۔درس و تدریس، ۷۔احسان و تصوف۔(۹۶)

حجِ بیت اللہ، بصارت و بصیرت

آپ کو ۱۹۸۵ء میں حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔(۹۷)، اس سفر کے مشاہدات، تاثرات اور واردات کو آپ نے اس مختصر کتاب (۹۸) میں قلمبند کیا ہے، اس کے بعض اہم مضامین و عنوانات یہ ہیں۔ ا۔اسلام کے امتیازات، ۲۔حج کی فرضیت و فضیلت، ۳۔سفرِ حج کی تیاری و روانگی، ۴۔مکہ مکرمہ میں داخلہ و عمرہ، ۵۔مناسکِ حج، ۶۔مراسمِ حج اور حضرت ابراہیم، ۷۔اعمالِ حج کی حکمتیں، ۸۔احرام کی حکمتوں پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> توحیدِ خالق سے وحدتِ مخلوق کا نظریہ پیدا ہوتا ہے، وحدتِ مخلوق سے مساواتِ انسانی کا نظریہ پیدا ہوتا ہے، دنیا میں شیطان نے وحدتِ مخلوق اور مساواتِ انسانی کے نظریئے کو تفریقِ انسانی کے نظریئے کے ذریعے زک دی ہے، اس نے انسانی معاشرے میں تفریقِ ملک، وطن، تفریقِ رنگ، نسل، لسان، تفریقِ طبقات و درجات، تفریقِ حاکم و محکوم وغیرہ پیدا کر دی۔(۹۹)

مزید لکھتے ہیں،

> نظریہ تفریق کا سب سے اہم مظہر لباس کی بوقلمونی ہے، رنگ برنگ لباس کے پردوں میں شیطان نے انسان کو گمراہ اور بدراہ کر دیا، اسلام نے حج کے موقع پر ترکِ لباس کے ذریعے، احرام کے ذریعے انسان کی انسانیت کو اور وحدت کو پھر جلوہ گر کر دیا۔(۱۰۰)

عورت، حیثیت، خاندانی کردار اور تعلیم

یہ پوری کتاب قرآن وسنت کی روشنی میں تحریر کی گئی ہے، اس کے اہم مندرجات یہ ہیں، ۱۔انسان کی حیثیت، ۲۔انسان کی آزمائش کے طریقے، ۳۔عورتوں کے لئے پردے کی اہمیت، ۴۔تشکیل خاندان، ۵۔شادی کی اہمیت، ۶۔عورت اور مرد کے باہمی تعلقات، ۷۔عورت کا کردار، ۸۔عورتوں کے حقوق، ۹۔عورت کی فطری خصوصیات، ۱۰۔عورت اور مرد جداگانہ صفتیں، ۱۱۔مرد کی ذمے داری، ۱۲۔عورت کی ذمے داری، ۱۳۔خواتین کی تعلیم، ۱۴۔خواتین کا نصاب تعلیم۔

داعیٔ اعظم ﷺ اور کثرتِ ازواج

یہ مختصر کتابچہ ۲۶ رصفحات پر مشتمل ہے، اس میں ان اہم عنوانات پر بحث کی گئی ہے، ۱۔کیا ازدواجی تعلقات گناہ ہیں؟ ۲۔عیش کوشی کے الزام کی حقیقت، ۳۔ازواجِ مطہرات کے کوائف، ۴۔کثیر بیویوں کی مصلحت، ۵۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی، حسنِ معاشرت کا نمونہ، اس کتاب کے پیش لفظ میں آپ تحریر فرماتے ہیں۔

> انسانی تاریخ میں اگر کوئی ہستی پس ماندہ طبقوں خصوصاً طبقۂ نسواں کا محسنِ اعظم کہلائے جانے کا مستحق ہے تو درحقیقت وہ نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے، دنیا میں سب سے پہلے عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق آپ نے ہی عطا کئے ہیں، آج جہاں کہیں بھی عورتوں کو حقوق مل رہے ہیں یا ان کے حقوق کی باتیں چل رہی ہیں، وہ سب نبی عربی ﷺ کے نعرۂ حق کی صدائے بازگشت ہے۔(۱۰۱)

رسولِ اکرم ﷺ کا اسوۂ تعلیمی

یہ بھی مختصر سا کتابچہ ہے اور چھوٹے سائز کے ۳۲ رصفحات پر مشتمل ہے، یہ کتابچہ درحقیقت دو حصوں، ۱۔رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ تعلیمی کا نظری حصہ، ۲۔عملی حصہ پر مشتمل ہے، مگر مسلسل مضمون کی صورت میں ہے، آخر کتاب میں تحریر کرتے ہیں:

> جو شخص بھی آپ ﷺ کے کارناموں پر نظر ڈالے گا وہ تسلیم کرے گا کہ آپ نے معلمی کا

حق ادا کر دیا۔۲۳ سال کی قلیل سی مدت میں ایک جاہل و ناخواندہ ملک میں خواندگی اور تعلیم کا انقلابِ عظیم برپا کر دیا، جس ملک میں پہلے خواندہ افراد کی تعداد ۱۸/ سے زیادہ نہ تھی، وہاں خواندگی کا معیار ۸۰، ۷۰ فیصد تک پہنچا دیا۔(۱۰۲)

تاریخ نظریۂ پاکستان

یہ کتاب بنیادی طور پر تو تحریکِ پاکستان کے مختلف مراحل کا احاطہ کرتی ہے، البتہ اس کا پہلا باب متعلقاتِ سیرت پر ہے، ے اس کے اہم عنوانات یہ ہیں، ا۔اسلام کا نظامِ زندگی اور بعد کے تغیرات، ۲۔تدوینِ علوم اسلامی، ۳۔اسلامی نظام کے مختلف شعبوں پر عمل، وغیرہ، ''خود مختار آزاد معاشرہ'' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں!

> ۱۳ سال مکہ مکرمہ میں محکومی اور مقہوری کی زندگی گزارنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے سازگار ماحول میں پہنچے تو آپ ﷺ نے وہاں اسلامی ریاست قائم کر دی، اسلامی سنہ کا آغاز ہجرت سے ہوتا ہے، ہجرت اسلامی ریاست کے قیام کے مترادف ہے، اس سے اسلام میں ریاست اور حکومت کی اہمیت واضح ہوتی ہے، اور آپ ﷺ خود اس ریاست کے سربراہ بنے، وہاں آپ ﷺ نے پوری طرح اسلامی احکام نافذ فرمائے، وہاں آپ ﷺ نے صحیح اسلامی معاشرہ قائم فرما دیا۔(۱۰۳)

سیرتِ طیبہ اور فنونِ لطیفہ

یہ اہم مضمون جو اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد بھی ہے، السیرۃ (۱۰۴) میں شائع ہوا تھا، اس میں فنونِ لطیفہ کے سلسلے میں اسلام کا موقف اور اس میدان میں اسلامی سرگرمیوں کا منبع اور اس کے امتیازات بیان کیے گئے ہیں، فرماتے ہیں۔

> اللہ تعالیٰ فطرتِ انسان کا خالق ہے، انسانی فطرت اور مزاج کا شناسا ہے، اس کو انسان کی کمزوری کا علم ہے، اس کی طبیعت اور جبلت کا تقاضا حسی و ابستگی ہے، جس سے انسان اپنا قلبی تعلق جوڑے، اس کمزوری کا خیال رکھتے ہوئے اس نے حسی دنیا میں دل بستگی کے لئے تین مظاہرات کو اپنی ذات سے نسبت قائم کرنے کی اجازت دی ہے،

۱۔ رسول اللہ ﷺ، ۲۔ کلام اللہ، ۳۔ بیت اللہ۔ (۱۰۵)

آگے چل کر ''کلام اللہ'' پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں!

کلام اللہ کو حفظ کرنا بھی خاص مسلمانوں کا امتیازی وصف ہے، دنیا کی کوئی قوم اپنی کتاب کی حافظ نہیں ہے، کلام کے لکھنے سے ایک اور فن وجود میں آیا، جس کو حسنِ خط یا خطاطی کہتے ہیں، عربی خط کو انہوں نے کئی کئی طریقوں سے لکھا، خط نسخ، خط ثلث، رقاع، توقیع، نستعلیق، پھر قرآن مجید کی تزئین و آرائش پر غیر معمولی محنت کی، یہ فن کے نادر نمونے دنیا کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، تزئین اور حسنِ خط کے معاملے میں کوئی قوم مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ (۱۰۶)

اوپر تحریر کی گئی سطور سے آپ ﷺ کی خدمات خصوصاً سیرت کا کسی حد تک اندازہ ہوتا ہے، البتہ اس تحریر کو جامع اس بنا پر نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کے بہت سے مضامین اور کتب منتظرِ طباعت ہیں، کتنے ہی مضامین مختلف رسائل کی فائلوں میں موجود ہیں، اور وقتِ تحریر محرر کے سامنے نہیں، یقیناً ان سب کے سامنے آنے سے پروفیسر سید محمد سلیم رحمۃ اللہ علیہ کی گراں قدر خدمات کا صحیح اندازہ ہو سکے گا، ذیل میں اب تک معلوم ہونے والی کتب کی فہرست الفبائی ہے ترتیب کے اعتبار سے پیش کی جا رہی ہے۔

فہرست کتب

	نام	صفحات	اشاعت
۱۔	آغازِ اسلام میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم	۶۲	طبع اول ۸۳ء، دوم ۸۵ء، ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور۔
۲۔	ابتدائی تعلیم کا نصاب	۔	۔
۳۔	اردو کتابت کے چند کارآمد اصول	۲۲	طبع اول ۸۶ء، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
۴۔	اسلام کا نظامِ تعلیم (تین عہد)	۱۷۴	طبع اول ۸۳ء، سوم ۸۶ء، چہارم ۹۴ء، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور
۵۔	اسلام کا نظریہ تعلیم	۵۶	طبع اول ۷۸ء، البدر پبلی کیشنز لاہور

یہ بعد میں ''اسلامی تعلیم بنیادی تصورات وافکار'' کا حصہ بن گئی۔

۶۔	اسلامی تعلیم، بنیادی تصورات وافکار	۱۶۰	اشاعت اول ۸۹ء، ادارہ تعلیمی تحقیق
۷۔	اسلامی زندگی	۷۲	طبع اول، ۸۹ء، دوم ۹۱ء، تحقیق
۸۔	اسلامی نظامِ تعلیم کی اساس	۱۶	طبع اول ۹۱ء، ادارہ تعلیمی تحقیق
۹۔	اصولِ کتابت	-	-
۱۰۔	تاریخ خط وخطاطین	زیرِ طبع	زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز کراچی
۱۱۔	تاریخ قرآن مجید،	۴۰	اشاعت اول، ۹۸ء، وجوہ اکیڈمی اسلام آباد
۱۲۔	تاریخ نظریہ پاکستان	۳۰۰	اول ۸۵ء، دوم ۸۷ء، سوم ۹۶ء، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور،
۱۳۔	ترکستان اور ترک اقوام	۴۸	اول ۹۲ء، بعد میں بھی شائع ہوئی، فاران نشریات، لاہور،
۱۴۔	ترک وتاتاری اقوام	-	انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل اسٹڈیز پشاور
۱۵۔	تعلیمی انحطاط کے اسباب	۶۴	اول ۸۶ء، دوم ۸۹ء، ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور،
۱۶۔	جماعتِ اسلامی تعلیم کے میدان میں	۳۶	اول ۹۵ء، اسلامی نظامت تعلیم، لاہور،
۱۷۔	چھوٹے بچوں کی تعلیم وتربیت	۶۴	اول ۸۹ء، دوم ۹۱ء،
۱۸۔	حج بیت اللہ، بصارت وبصیرت	۷۴	اول ۹۷ء، شرتاج مطبوعات، لاہور
۱۹۔	حدود اللہ کا نفاذ شرفِ انسانیت کا تحفظ ہے	۳۲	اول ۸۷ء، دوم ۸۹ء، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور
۲۰۔	خاندانی یادگاریں	۱۶	اول ۹۶ء
۲۱۔	خوش نویسی کی تعلیم	-	-
۲۲۔	داعیٔ اعظم ﷺ اور کثرت ازواج	۳۰	اول ۹۵، شرتاج مطبوعات لاہور،
۲۳۔	درس گاہ کی ہم نصابی سرگرمیاں،	۳۰	اول ۹۱ء، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور
۲۴۔	دینی مدارس کی روایات اور نصاب کی خصوصیات		-

۲۵۔	دینی مدارس کے لئے نصاب کی تجاویز	۵۶	اول ۹۳ء // //
۲۶۔	رسالۂ دانشمندی (مقدمہ تعلیمات)	۳۰	اول ۸۷ء، دوم ۸۹ء // //
۲۷۔	رسول اکرم ﷺ کا اسوۂ تعلیمی	۳۲	اول ۸۱ء، حجاز پبلی کیشنز، لاہور
۲۸	زبان اردو، منزل بامنزل	۔	۔
۲۹۔	سورۂ فاتحہ، نظامِ تعلیم کی اساس،	۲۴	اول، ۸۷ء، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور
۳۰۔	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	۸۰	اول ۹۲ء، فاران نشریات، لاہور
۳۱۔	طبقۂ نسواں کا محسنِ اعظم ﷺ	۔	۔
۳۲۔	عصرِ حاضر کا چیلنج اور مسلمان استاد	۲۴	// // //
۳۳۔	علومِ جدیدہ کی اسلامی تشکیل (ترجمہ)	۱۰۰	اول ۸۹ء، ادارہ تعلیمی تحقیق، //
۳۴۔	عورت، حیثیت، خاندان، کردار اور تعلیم	۱۴۴	اول ۹۴ء // //
۳۵۔	عہدِ اسلامی کے عظیم مدارس	۶۲	اول ۹۷ء // //
۳۶۔	قرآن کا تصورِ تعلیم	۵۴	اول ۷۹ء // //
۳۷۔	قومیت و وطنیت	۶۴	اول ۸۸ء // //
۳۸۔	مسلمان اساتذہ کا مثالی کردار	۴۶	اول ۸۱ء // //
۳۹۔	مسلمان اور مغربی تعلیم	۳۶۸	اول ۸۵ء // //
۴۰۔	مسلمان خواتین کی دینی و علمی خدمات	۱۶۰	اول ۸۶ء، دوم ۸۹ء // //
۴۱۔	مسلمان مثالی اساتذہ و مثالی طلبہ	۱۷۲	۸۶ء //
۴۲۔	مشنری تعلیمی اداروں کا تنقیدی مطالعہ	۔	۸۶ء //
	یہ بعد میں مغربی تعلیم کی مخالفت کیوں؟ کے نام سے شائع ہوئی		
۴۳۔	مغربی تعلیم کی مخالفت کیوں؟	۴۴	۹۱ء //
۴۴۔	مغربی زبانوں کے ماہر علما	۱۵۲	اول ۹۳ء //
۴۵۔	مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ	۲۴۰	اول ۸۱، دوم ۸۶ء //
۴۶۔	مغربی نظامِ تعلیم، ملّی نقطۂ نظر سے	۴۸	اول ۷۶ء، تنظیم اساتذہ پاکستان
	یہ بعد میں ”مغربی نظامِ تعلیم، تنقید و تبصرہ“ کا حصہ بن کر شائع ہوئی۔		
۴۷۔	مغربی نظامِ تعلیم، تنقید و تبصرہ	۱۰۴	دوم ۸۹، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور

۴۸۔ ہندو پاک میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ۳۱۲ اول ۸۰ء، دوم ۸۶ء، سوم ۹۳ء، //

اب ان کتب کا ذکر کیا جاتا ہے جو غیر مطبوعہ موجود ہیں۔

۱۔ اسلامی نظام تعلیم کی حکمت وغایات

۲۔ اسلام کا فلسفۂ تعلیم، جہانی نقطۂ نظر

۳۔ اسلامی معاشرے میں قیادت وسیادت

۴۔ خلافت تمکین، خلافتِ عبودیت

۵۔ خطباتِ کالج

۶۔ چار عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنسوں کی سفارشات (ترجمہ)

۷۔ خلیفہ فی الارض

۸۔ تاریخ شکارپور، سندھ

۹۔ خوش نویسی کی تعلیم، تین ہے

۱۰۔ اسلامی اوزان اور پیمانے

۱۱۔ دین اسلام اور ملتِ اسلامیہ

۱۲۔ عظیم اسلامی مدارس کی تاریخ، (افریقی ممالک) ترجمہ

۱۳۔ // // (مشرقی ممالک) //

۱۴۔ عظیم مدارس وجامعات، امام ابوحنیفہؒ سے دیوبند تک

۱۵۔ مسلمان استادوں نے مجرانوں کے رخ موڑ دیئے

۱۶۔ منصبِ شہادت کے فرائض

۱۷۔ مسلمان خواتین کے لئے اعلیٰ تعلیمی اداروں کا مطالبہ (ترجمہ)

۱۸۔ مسلمانوں کا نظامِ تربیت اور پاکستان

۱۹۔ کیا مسلمان سلاطین حاکمِ مطلق تھے؟

۲۰۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات، دورِ جدید

۲۱۔ دنیائے اسلام اور اسلام

۲۲۔ مشرقی ترکستان (ترجمہ)

۲۳۔ مکتب کا نصابِ تعلیم

۲۴۔ قواعدِ کتابت

۲۵۔ نوابانِ مرشدآباد و بنگال (ترجمہ)

یہ چند صفحات پروفیسر سید محمد سلیم رحمہ اللہ کے حالات و خدمات کے حوالے سے سپردِ قلم ہوئے، ان کے مطالعے سے ایک بات بڑی روشن ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاضر کرم فرمائی اور توفیق سے آپ نے جن میدانوں میں خدمات انجام دیں، ان کے نقوش تا ابد واضح و روشن رہیں گے، اور آنے والے اہلِ علم و محققین اپ کی خوشہ چینی کو اپنے لئے باعثِ سعادت تصور کریں گے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو مقامِ بلند عطا فرمائے اور ہم سب کے علم و عمل میں اخلاص و برکت عطا فرمائے۔ آمین،

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و الہ و اصحابہ اجمعین

حواشی و حوالہ جات

۱۔ حکیم سید عبدالرؤف/ حالاتِ زندگی الحاج حکیم سید عبدالوحید چشتی قادری/ غیر مطبوعہ،

۲۔ ایضاً،

۳۔ حکیم قاضی سید اشرف علی کا انتقال ۲۹/رمضان ۱۲۷۹ھ کو ہوا۔

۴۔ حکیم عبدالعزیز کا انتقال ۲۹/ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ کو ہوا۔

۵۔ تاریخ وفات مہاراجہ الور، ۱۹۰۰ء

۶۔ حکیم سید عبدالرؤف/محولہ بالا

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً

☆ خودنوشت حالات پروفیسر سید محمد سلیمؒ

☆ پروفیسر عبدالحسیب احسن/مشمولہ ماہنامہ آثارِ معلم، لاہور/ مدیر ظفر حجازی/ جنوری ۲۰۰۱ء/ص ۵۶

۹۔ حکیم عبدالرؤف/محولہ بالا

☆ روزنامہ آئینہ، نواب شاہ، ۲۸، جنوری ۶۸ء

۱۰۔ پروفیسر سید محمد سلیم/ اسکول کے زمانے کی یادیں،

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ پروفیسر عبدالحبیب احسن/ افکارِ معلم/ جنوری ۲۰۰۱ء/ص ۵۶

۱۳۔ اسکول کے زمانے کی یادیں/ ایضاً

۱۴۔ پروفیسر عبدالحبیب احسن/ محولہ بالا

۱۵۔ ایضاً /ص ۵۷

۱۶۔ پروفیسر سید محمد سلیم، اساتذہ کرام اور دیگر اہل علم/ افکارِ معلم، فروری ۲۰۰۱ء، ص ۷۷،

۱۷۔ ایضاً /ص ۷۸

۱۸۔ ایضاً

☆ افکارِ معلم/ فروری ۲۰۰۱ء/ص ۴۷

۱۹۔ پروفیسر سید محمد سلیم، ہمارے زمانے کے اساتذہ/ غیر مطبوعہ،

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ پروفیسر عبدالحبیب احسن/ص ۶۱،

۲۲۔ ایضاً /ص ۶۲

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ ڈاکٹر رانا خلیل/ پروفیسر سید محمد سلیمؒ کی علمی خدمات/ غیر مطبوعہ

۲۵۔ بخاری الصحیح /باب اول، ص ۱

۲۶۔ پروفیسر سید محمد سلیمؒ/ مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ/ ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، لاہور، ۱۹۸۱ء/ص ۸، یہ کتاب ۸۰ء میں تحریر ہوئی۔

۲۷۔ // /اسلامی تعلیم بنیادی تصورات و افکار/ // // ۱۹۸۹ء/ص ۶،

۲۸۔ سید عزیز الرحمٰن/ ماہنامہ تعمیر افکار کراچی/ مدیر ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری/ جنوری ۲۰۰۱ء/ص ۲۹۔۳۰،

۲۹۔ ایضاً /ص ۳۰،

۳۰۔ افکارِ معلم/ جنوری ۲۰۰۱ء/ص ۲۳،

۳۱۔ سید عزیز الرحمٰن/ تعمیر افکار/ص ۳۰،

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۱،

۳۲/الف۔ماہر تعلیم پروفیسر سید محمد سلیم/پروفیسر ڈاکٹر احسان الحق/مشمولہ اردو بک ریویو، نئی دہلی/مدیر مسؤل، عارف اقبال/شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۰ء

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ ملک نواز احمد اعوان/وہ ایک حرف تھا لیکن کتاب جیسا تھا/افکارِ معلم/فروری ۲۰۰۱ء/ص ۳۷۔۳۸،

۳۵۔ پروفیسر سید محمد سلیم رحمہ اللہ راقم کے نانا تھے۔

۳۶۔ تحریر ۲۱ مارچ ۱۹۹۶ء

۳۷۔ تحریر ۶ اکتوبر ۱۹۹۶ء

۳۸۔ تحریر ۲۱ مارچ ۹۶ء

۳۹۔ تحریر ۱۰ جون ۹۴ء

۴۰۔ تعمیر افکار/ص ۳۲ تا ۳۴،

۴۱۔ محمد موسیٰ بھٹو/نگدستہ/سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدرآباد ۹۸ء/ص ۱۱۲، ۱۱۳،

۴۲۔ افکارِ معلم/فروری ۲۰۰۱ء/ص ۳۶،

۴۳۔ پروفیسر سید محمد سلیم/خودنوشت حالات/غیر مطبوعہ،

۴۴۔ افکارِ معلم/جنوری ۲۰۰۱ء/ص ۶۲، ۶۴،

۴۵۔ افکارِ معلم/فروری ۲۰۰۱ء/ص ۴۹،

۴۶۔ اردو بک ریویو/ص ۶۰

۴۷۔ افکارِ معلم/جنوری ۲۰۰۱ء/ص ۲۷،

۴۸۔ ایضاً /ایضاً /ص ۵۵،

۴۹۔ ایضاً

۵۰۔ محمد موسیٰ بھٹو/نگدستہ/ص ۱۰۸، یہ مضمون آپ کی زندگی میں تحریر کیا گیا تھا۔

۵۱۔ افکارِ معلم/جنوری ۲۰۰۱ء/ص ۵۷

۵۲۔ القرآن/سورۂ فاطر/آیت ۲۸

۵۳۔ پروفیسر سید محمد سلیم/اسلامی تعلیم، بنیادی تصورات و افکار/ص ۷۷،

۵۴۔ پروفیسر سید محمد سلیم/عہد اسلامی کے عظیم مدارس (جامعات)/ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۹۷ء/ص ۷،

۵۵۔ ایضاً /ص ۵،

۵۶۔ پروفیسر سید محمد سلیم/مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ/ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور/ص ۸۱/ص ۹۸، ۹۹،

۵۷۔ ایضاً /ص ۸۳

۵۸۔ ایضاً /ص ۸۴

۵۹۔ پروفیسر سید محمد سلیم/تاریخ نظریہ پاکستان/ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۹۶ء/ص ۱۳۶،

۶۰۔ ایضاً /ص ۱۳۷

۶۱۔ ایضاً /ص ۱۵۰،

۶۲۔ اسلامی تعلیم بنیادی تصورات وافکار/ص ۲۵،

۶۳۔ ایضاً /ص ۴۰،

۶۴۔ مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ/ص ۱۷۵

۶۵۔ افکارِ معلم/جنوری ۲۰۰۱ء/ص ۵۸، ۵۹،

۶۶۔ خودنوشت حالات

۶۷۔ افکارِ معلم جنوری ۲۰۰۱ء/ص ۵۹، ۶۰،

۶۸۔ // فروری ۲۰۰۱ء/ص ۹

۶۹۔ اس کی مکمل فہرست (۹۶ء تک) موجود ہے، مرتب ڈاکٹر رانا محمد خلیل

۷۰۔ افکارِ معلم/فروری ۲۰۰۱ء/ص ۶۲، ۶۳،

۷۱۔ ناشر: ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، طبع اول، ۱۹۸۰ء، دوم ۸۶ء، سوم ۹۳ء،

۷۲۔ // // // // ۹۷ء

۷۳۔ // // // // ۸۸ء

۷۴۔ // // // // ۸۵ء، دوم ۸۷ء، سوم ۹۶ء

۷۵۔ // // // // ۸۳ء، سوم ۸۶ء، چہارم ۹۳ء

۷۶۔ // // // // ۸۳ء

۷۷۔ // // // // ۸۹ء

۷۸۔ حجاز پبلی کیشنز // // ۸۱ء

۷۹۔ شاہ تاج مطبوعات // // ۹۵ء

۸۰۔ ادارہ تعلیمی تحقیق // // ۸۷ء، دوم ۸۹ء

۸۱۔ شرتاج مطبوعات // // ۹۷ء

۸۲۔ ادارہ تعلیمی تحقیق // // ۹۴ء

۸۳۔ زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز، کراچی زیرطبع

۸۴۔ افکارِ معلم، لاہور، دسمبر۹۲ء

۸۵۔ // // اگست۹۴ء

۸۶۔ // // فروری۹۵ء

۸۷۔ // // اگست۹۶ء

۸۸۔ // // ستمبر//

۸۹ء تا ۹۲ء غیر مطبوعہ

۹۳۔ شش ماہی السیرۃ عالمی/شمارہ۲

۹۴۔ ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور اپریل ۲۰۰۰ء

۹۵۔ اسلام کا نظامِ تعلیم،/۱۳

۹۶۔ ص ۱۴۸ تا ۱۶۰

۹۷۔ پروفیسر سید محمد سلیم/ حج بیت اللہ، بصارت و بصیرت/ص۲

۹۸۔ یہ کتاب ۳۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

۹۹۔ ص ۴۰،

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۰۱۔ ص ۳

۱۰۲۔ ص ۳۱

۱۰۳۔ ص ۳۲

۱۰۴۔ شمارہ۲، رمضان المبارک ۲۰۰ء

۱۰۵۔ السیرۃ شمارہ۲،/ص ۲۰۱

۱۰۶۔ ایضاً/ص ۲۰۳

پروفیسر سیّد محمد سلیمؒ

نبی نوعِ انسان پر حضور ﷺ کے احسانات

خلیفۃ اللہ

اسلام وہ دین ہے جس نے نوعِ بشر کو شرفِ انسانیت سے ہم کنار کیا۔ ساری مذہبی کتابوں میں قرآن مجید ہی وہ کتاب ہے جس نے انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کا اعلان کیا ہے۔ خلیفہ ہونے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ زمین پر انسان خود مختار ہے اور آزاد ہے۔ ساری کائنات جامد غیر ذی روح اور غیر ذی عقل مخلوقات سے بھری پڑی ہے۔ فرشتے بھی حکم کے پابند ہیں اور غلام ہیں۔ کائنات میں صرف انسان کی وہ واحد ہستی ہے جو آزاد ہے اور خود مختار ہے۔

انسان کے خلیفہ ہونے کا اعلان سن کر ازل میں فرشتوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ یہ خود مختار ہستی ضرور دنیا میں فتنہ و فساد پھیلائے گی۔ ضرور خون خرابہ کرے گی، اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم اور عقل کی نعمت سے نوازا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۱)

اور اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام نام سکھا دیئے۔

اسماء سے مراد تصورات (Concepts) ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرتِ آدم میں تصور سازی، یعنی انتزاعِ خصائص محسوسات کی صفت ودیعت کر دی ہے۔ تخیل، تفکر، تدبر اور تعقل سب درحقیقت تصور سازی کے مراتب عالیہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و فہم کی دولت

سے مالا مال کر دیا۔ اعتراض کے جواب میں عقل کی بخشش کا مطلب یہ ہوا کہ اعتراض کا دفعیہ عقل کے ذریعہ ہو جائے گا۔

عقل انسان کی بہترین رفیق ہے۔ مادی اشیا کو سمجھنے میں اور پھر ان کو استعمال کرنے میں عقل نے انسان کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ دنیا میں انسان کے گرد سب سے بڑا دائرہ مادی اشیاء کا پھیلا ہوا ہے۔ یہ طبیعات کی دنیا ہے۔ مادی دنیا کو سمجھنے کے لئے عقل بالکل کافی ہے۔ عقل انفرادی سے اگر کبھی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو عقل اجتماعی اس غلطی کی اصلاح کر دیتی ہے۔ مادے کو تحلیل کرنے، اس کے خواص معلوم کرنے، اس کو پرکھنے جانچنے اور استعمال کرنے میں عقل انسانی کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ صدیوں سے عقل کی کدوکاوش جاری ہے۔ اس کے نتیجے میں مادی دنیا سے متعلق جمع کردہ ایک عظیم الشان ذخیرہ آج انسان کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اس ذخیرے کو استعمال کرنے سے انسان نے حیران کن ایجادات اور اختراعات کر ڈالی ہیں۔ اس کی وجہ سے آج انسان ہوا میں اڑ رہا ہے، پانی میں تیر رہا ہے اور پہاڑوں کا جگر چیر رہا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے گرد دوسرا بڑا دائرہ خود انسانوں کا ہے۔ یہ دنیائے انسانیت ہے۔ انسان غیر ذی روح اور غیر ذی عقل مادہ نہیں ہے۔ انسان عقل، شعور اور ارادے کی دولت سے مالا مال ہے۔ اس لئے انسان کا تجزیہ کرنا اور تحلیل کرنا عقل کے لئے انتہائی دشوار کام ہے۔ پھر ذی شعور اور با اختیار ہونے کے سبب کوئی بھی دو انسان اس طرح یکساں نہیں ہیں، جس طرح دو پتھر یکساں ہوتے ہیں۔ اس لئے عالم انسانیت میں، عمرانی، تمدنی، اخلاقی اور مذہبی پہلوؤں میں عقل کی کارگزاری کی تحسین کرتے ہوئے بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عالم انسانیت میں عقل کی کدوکاوش کے نتائج اتنے صحیح اور یقینی نہیں ہوتے جتنے کے مادی دنیا سے متعلق یقینی ہوتے ہیں۔ یہاں عقل کی تنقیص مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی محدودیت اور نارسائی کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

انسان کے گرد تیسرا دائرہ مادی دنیا سے ماورئی اور عالم انسانیت سے ماورئی حقیقت کبریٰ کا ہے۔ حقیقت کبریٰ کے علم کے بغیر نہ عالم طبیعات کی حقیقت کھلتی ہے اور نہ عالم انسانیت کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کبریٰ کا دائرہ عقل انسانی کے لئے غیب ہی غیب ہے۔ فطرت انسانی کو غیب جاننے کا بے حد اشتیاق ہے۔ مگر یہاں پرواز کرنے سے عقل انسانی کے پر جلتے ہیں۔ اس مختصر جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے بلاشبہ عقل رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہے مگر بعض دائروں میں اس کی رہنمائی ناکافی ہے۔ اس لئے فرشتوں کے اعتراض کا یہ شافی اور وافی جواب نہیں ہوا اس موقعے پر عقل کی نارسائی اور محدودیت کا نقص دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک دوسرے انعام سے نوازا، فرمایا:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (۲)

ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے (نیچے) اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اور جو (اس ہدایت) کا انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہی آگ میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عقل کا نقص، میں ہدایت الٰہی سے دور کردوں گا۔ یہ ہدایت میں اپنے رسولوں اور نبیوں کے ذریعے دنیا میں انسانوں کو بھیجتا رہوں گا۔ اب جو لوگ اس ہدایت کی پیروی میں زندگی بسر کریں گے وہ امن و چین کی زندگی گزاریں گے۔ اور وہ خلافت کے فرائض پورے کریں گے۔ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر ملک میں اور ہر قوم میں ہدایت دینے والے نبی اور رسول بھیجے۔ فرمایا

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۔ (۳)

بلاشبہ آپ تو خبردار کرنے والے ہیں اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے۔

اللہ کی ہدایت دو اجزا پر مشتمل ہوتی تھی۔ کتاب ہدایت اور عملی انطباق بتانے والی سنت رسول ﷺ، قدیم زمانے سے اللہ تعالیٰ مختلف قوموں میں کتاب اور رسول دونوں بھیجتا رہا۔ آخری کتاب ہدایت

قرآن مجید ہے اور آخری مستند نمونہ ہدایت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہے۔ آج ہدایت الٰہی صرف قرآن مجید سے اور سنت رسول ﷺ سے مل سکتی ہے۔

یہ ہدایت انسانی ذہن کی ساختہ پرداختہ نہیں ہے۔ یہ ہدایت علیم وخبیر خدائے بزرگ وبرتر نے براہ راست حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہے۔ یہ ہدایت عقل کے نقائص دور کرتی ہے اور اس سے محدودیت کو رفع کرتی ہے۔ ہدایت سے عقل انسانی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ یہ ہدایت ان تمام ضروری علوم ومعارف کا ذخیرہ ہے جس کی نوع انسانی کو ضرورت ہے۔ جو عقل انسانی کی دسترس سے بالا ہے۔ اس ہدایت کو آئے ہوئے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ اس ہدایت نے عالم انسانیت کو ہزارہا انعامات دیئے ہیں۔ عالم انسانیت اس ہدایت سے مختلف طریقوں سے مستفید اور متمتع ہوتی رہی ہے۔ رحمت عالم ﷺ کا فیضان عام رہا ہے۔ وہ اقوام جو ان پر ایمان لائیں وہ بھی اور وہ اقوام جو ان پر ایمان نہیں لائیں وہ بھی، دونوں رحمت عالم اور ہادی اعظم ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ اس سرچشمہ ہدایت سے ان چودہ صدیوں میں جو فیض جاری ہوا ہے اس کا ہم مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔ انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا تو بڑا وقت اور بڑی محنت چاہتا ہے، ہم تو صرف چند عنوانات کے تحت اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

انسانی عظمت

﴿۱﴾ اسلام سے قبل انسان ہر جگہ ذلیل وخوار تھا۔ شرک وبت پرستی نے ہر جگہ انسان کی تذلیل کر رکھی تھی۔ کہیں وہ مٹی اور پتھر کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو رہا تھا۔ کہیں اپنے جیسے گوشت پوست کے انسانوں کو خدائی کے تخت پر بٹھا کر ان کے سامنے عجز ونیاز سے اپنی پیشانی رگڑ رہا تھا۔ اسلام نے انسان کو شرف انسانیت سے آگاہ کیا۔ اس کو خلیفہ اللہ فی الارض ہونے کا احساس دلایا۔ ساری مخلوقات کے مقابلے میں اس کو اپنی عزت نفس کا شعور دلایا۔

شرک وبت پرستی کے خلاف اسلام نے اس زور وشور سے صور پھونکا کہ قصر بت پرستی میں زلزلہ آ گیا اور بت پرست خود بت شکن بن گئے۔ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر شنکر اچاریہ نے ہندوستان میں مورتی کھنڈت کا زبردست پرچار کیا۔ جس کے بعد کبیر پنتھی، دادو پنتھی اور نانک پنتھی جیسے فرقے ہندوؤں میں پیدا ہوئے، جو بت پرستی کے شدید مخالف ہیں، جو شرک کا رد کرتے ہیں اور توحید کا دم بھرتے ہیں۔

اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہوکر بلکہ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھ کر مارٹن لوتھر نے کیتھولک مذہب کے خلاف بغاوت کی، پوپ کے خلاف اور بت پرستی کے خلاف جہاد شروع کیا اور مسیحیت کا وہ ایڈیشن تیار کیا جس میں بت پرستی بالکل نہیں ہے۔

﴿۲﴾ مسیحی دنیا میں انسان کے پیدائشی گنہگار (Original Sin) ہونے کا عقیدہ رائج تھا۔ کتنی ہی بڑی نیکی ہو اس گناہ کو زائل نہیں کرسکتی تھی۔ ہندو دنیا میں پیدائشی بدی (شودر) کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ پیدائشی نیکی (برہمن) کا عقیدہ بھی رائج تھا۔ جس کے بعد نیکی اور بدی کا سب عمل بیکار تھا۔ اس طرح نیک اعمال اور حسن کردار کی جانب سے ہر جگہ غفلت تھی۔ اسلام نے ان باطل عقیدوں کی تردید کی۔ نجات کا بھی اور ہلاکت کا بھی دارومدار اعمال پر بتایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس کے ماں باپ ہیں جو اس کو یہودی، عیسائی یا مشرک، بنا لیتے ہیں۔ (۳، الف)

پیدائشی گنہگار ہونے کا تصور قطعاً باطل ہے۔ اسی خیال کو علامہ اقبال نے اپنے شعر میں پیش کیا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

﴿۳﴾ اسلام نے دنیا کو انسانی جان کا احترام سکھایا۔ اسلام سے قبل ساری دنیا میں قتل اطفال خصوصاً قتل بنات کا رواج عام تھا۔ لوگ لڑکی کی پیدائش کو عار سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس رسم قبیح کو سختی سے ختم کردیا۔ آج دنیا کو تسلیم ہے کہ دنیا سے قتل اطفال کی لعنت کا انسداد نبی عربی ﷺ کی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ دائرۃ المعارف مذہب واخلاق میں درج ہے۔

As a moral reformer Mohammed has to wim crdit that abolibtion of infanticide encyclopaedia of religion and ethics (4)

﴿۴﴾ یہ اسلام ہے جس نے سب سے پہلے خودکشی کو حرام قرار دیا اور کہا کہ یہ بزدلی ہے اور کارزار حیات سے راہ فرار ہے۔ ورنہ آج بھی کتنے ہی نام نہاد دانشور ایسے ہیں جو خودکشی کو جائز سمجھتے ہیں۔

﴿۵﴾ اسلام نے بجز عدالتی چارہ جوئی کے کسی دوسری صورت میں قتل انسانی کی اجازت نہیں دی ہے۔

اور انسانی جان کو انتہائی محترم قرار دیا ہے۔ اقبال کہتا ہے،

آدمیت احترام آدمی باخبر شواز مقام آدمی

فسطائی نظام ہائے فکر میں افراد کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی، وہ معاشرے کی مشین میں ایک غیر اہم پرزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فسطائی حکمران انسانوں کو قتل کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ ہٹلر نے چھ لاکھ یہودیوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے قتل کرایا تھا۔ روس میں اجتماعی کاشتکاروں کی اسکیم کے نفاذ کے موقع پر اسٹالن نے ۱۵ لاکھ انسانوں کو لقمہ اجل بنا دیا۔ ماؤزے تنگ کے حکم سے پیکنگ سے لہاسہ (تبت) تک ریل کی پٹری بچھانے میں کم از کم پندرہ ہزار مزدور مر کھپ گئے۔ وہاں انسان کی کوئی قدر نہیں ہے۔ ان کے مقابلے میں اسلام کے خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

لو انّ عناقاً ذهبت بشاطئ الفرات لا خذبها عمر يوم القيامة

(۵)

بصرہ کے ساحل پر (انسان تو کجا) اگر بکری کا بچہ بھی ظلم سے مارا جائے گا تو کل قیامت کے روز عمر سے اس کی باز پرس ہوگی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے احترام انسانیت کا کتنا لطیف احساس افراد کے اندر پیدا کر دیا تھا۔

﴿۶﴾ انسان عقل و فہم، شعور و احساس سے عبارت ہے۔ انسان کو عقل و فہم سے عاری کرنا درحقیقت اس کو شرف انسانیت سے نیچے گرا دینا ہے۔ شراب خوری اور نشہ بازی دراصل عقل و شعور کو زائل کر دینے والا عمل ہے۔ شراب خوری انسانیت کے لئے باعث ننگ و رخواری ہے۔ ہزارہا عائلی اور معاشرتی خرابیوں اور تباہ کاریوں کی جڑ نشہ بازی کی علت ہے۔ اسلام نے شرف انسانیت کو تحفظ دینے کے لئے نشہ خوری کو حرام قرار دیا ہے۔ آج ساری دنیا اس عیب میں مبتلا ہے، مگر مسلمان بڑی حد تک اس علت سے محفوظ ہیں۔ عظیم مورخ آرنلڈ ٹوئین بی لکھتا ہے:

دنیا کی آبادی کا چھٹا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ شراب خوری کی لعنت سے بچا ہوا ہے۔ کروڑوں مسلمان ایسے ہیں جنہوں نے نہ شراب کا رنگ دیکھا ہے اور نہ وہ اس کی بو سے واقف ہیں۔

شراب نوشی کی تباہ کاریوں کا احساس دنیا کو اب ہوتا جا رہا ہے۔ مگر اسلام نے چودہ سو سال قبل ہی

اس کو حرام قرار دیدیا تھا۔

﴿۷﴾ جسمانی طہارت اور نفاست کا جو معیار اسلام نے اپنے پیروؤں میں مقرر کیا ہے، وہ آج بھی دوسری اقوام میں ناپید ہے۔ افلاس اور ناداری کے باوجود مسلمان زیادہ عبادت پسند ہیں۔ نجاست غلیظہ اور نجاست خفیفہ، نجاست بدنی اور نجاست حکمی کا تصور بھی دوسری اقوام میں نہیں ہے۔ اسلامی طریقہ غسل اور مغربی طریقہ غسل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

﴿۸﴾ مذہب اور عقیدے کی آزادی سب سے پہلے اسلام نے دی ہے۔ قرآن مجید واشگاف الفاظ میں اعلان کرتا ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ (۲)

اے نبی صاف کہدو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔

دوسری جگہ فرمایا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (۷)

دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط افکار سے چھانٹ کر الگ کر دی گئی ہے۔

اسلام سے قبل کسی مذہبی کتاب میں اور کسی حکیم اور فلسفی کی تعلیمات میں مذہب اور عقیدہ کی آزادی اور رواداری کی تعلیم کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ یہ اسلام ہے جس نے دنیا کو یہ آزادی بخشی ہے۔ مذہبی اقلیتوں نے جتنا آرام اور سکون اسلامی حکومتوں میں پایا ہے، اتنا کسی دور میں اور کسی حکومت میں نہیں پایا۔ مسلمانوں نے جداگانہ ملت قرار دے کر غیر مسلموں کو نہ صرف دین وعقیدہ کی آزادی دی تھی بلکہ اپنی کلچر اور ثقافت کے تحفظ کا بھی حق دیا تھا۔ اس کے برخلاف آج کے دور میں بلند بانگ آزاد خیال اور لادینی ریاستیں اقلیتوں کی ثقافت اور تہذیب کو اکثریت کے رنگ میں مدغم کرنے پر مصر ہیں اس طرح ان کا تہذیبی وجود فنا کر دینا چاہتی ہے۔

﴿۹﴾ لادینیت کی بے مقصد زندگی کے مقابلے میں ایمان باللہ کی بامقصد زندگی ہزار درجہ افضل ہے۔ اور ہزار گونہ سکون وطمانیت بخش ہے۔ ایمان باللہ انسان کے ضمیر کے مدار خلاص عمل اور خود احتسابی کے جذبہ کو تقویت پہنچاتا ہے۔ رزم گاہ خیر وشر میں یہ جذبہ انسان کا سب سے قوی ہتھیار ہے۔

ایمان باللہ کے بعد ایک مومن مسلسل اور پیہم اخلاقی اور روحانی ترقی کرتا رہتا ہے۔ عبادات کی پابندی سے انسان کے اندر انضباطِ نفس اور مستقل مزاجی کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی ہر دم یہ خواہش رہتی ہے کہ حسن عمل اور حسن کردار کا بہتر سے بہتر نمونہ پیش کر کے اپنے رب کریم کی رضا حاصل کروں۔

عورت کا وقار

﴿۱﴾ اسلام سے قبل عورت نہایت پستی میں تھی۔ نہ اس کی کوئی حیثیت تھی نہ کسی شے کی مالک بن سکتی تھی۔ ہندوستان میں شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کی زندگی اس قدر اجیرن ہو جاتی تھی کہ وہ اس لئے شوہر کے ساتھ ہی جل مرنا پسند کرتی تھی۔ مسیحی دنیا میں بھی عورت کا حال خراب تھا۔ ۳۲۵ عیسوی میں بمقام Nicaea (ترکی) میں پادریوں کی ایک عظیم الشان کونسل منعقد ہوئی تھی۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ عورت انسان نہیں ہے۔ اس کی فطرت داغدار ہے۔ ایران میں عورت کی حالت اور بھی ابتر تھی۔ وہاں محرمات بھی شہوانی تعدی سے محفوظ نہیں تھیں۔ عورت لذت اندوزی کا ایک کھلونا تھی۔ شاہنشاہ دارا اول اپنے باپ بہمن کا بیٹا بھی ہے اور نواسہ بھی ہے۔ مانی کے مذہب نے تو زر، زمین اور زن کو مشترکہ ملکیت قرار دیدیا تھا۔ جس کے نتیجے میں جتنے جنرل تھے وہ سب ملکہ پوران دخت کے شوہر بن گئے تھے۔ اس وقت کی مذہب دنیا کا یہ حال تھا۔

﴿۲﴾ مسیحی دنیا نے عورت کی جداگانہ شخصیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شادی سے قبل وہ باپ کی شخصیت کا جز رہتی تھی۔ اور شادی کے بعد وہ شوہر کی شخصیت کا ضمیمہ بن جاتی تھی۔ پہلے وہ مس جان سن کہلاتی تھی اب وہ مسز تھامسن کہلاتی تھی۔

اسلام نے عورت کو مستقل بالذات شخصیت کا مالک قرار دیا۔ شادی سے قبل بھی وہ عائشہ اور فاطمہ تھی اور شادی کے بعد بھی وہ عائشہ اور فاطمہ رہتی ہے۔ مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر آج کل بعض مسلمان عورتیں اپنا نام مغربی طریقے پر لکھنا پسند کرتی ہیں، مثلاً طاہرہ خورشید، ان کم فہموں کو یہ خبر نہیں کہ اس طریقے سے وہ اپنی مستقل حیثیت کا انکار کر رہی ہیں اور شوہر کی شخصیت کا ضمیمہ بننا قبول کر رہی ہیں۔

﴿۳﴾ دنیا میں سب سے پہلے اسلام نے ترکہ میں لڑکے کے ساتھ لڑکی کو بھی حصہ دار مقرر کیا۔ اب اگر مسیحی دنیا اور ہندو دنیا (ہندو کوڈ ۱۹۵۶ء) عورتوں کو وراثت میں شریک کر رہی ہے، تو یہ دراصل اسلام کی صدائے بازگشت ہے۔ اسلام نے عورت کو ملکیت رکھنے کا بھی حق دیا۔ جو اس صدی میں

اہل یورپ ان کو عطا کر رہے ہیں۔

﴿۴﴾ اسلام نے عورت کا درجہ معاشرے میں اخلاقی اور دینی اعتبار سے بلند کیا۔عورت کی تین حیثیتیں ہیں۔ماں، بیوی اور لڑکی۔ماں کے متعلق حضور اکرم نے فرمایا۔

ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔(۸)

قرآن مجید کا حکم ہے:

والدین سے اُف بھی مت کہو، ان کو جھڑکو بھی نہیں۔(۹)

بیویوں کے متعلق حضورﷺ کی حدیث ہے۔

جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں اور جو اپنے اہل وعیال پر سب سے زیادہ مہربان ہو، وہی ایمان میں بھی سب سے زیادہ کامل ہے۔(۱۰)

لڑکی کی پیدائش کو آج بھی بعض اقوام برا سمجھتی ہیں۔اس سلسلے میں حضورﷺ نے فرمایا:

جس شخص کے دو لڑکیاں پیدا ہوں اور وہ ان کی اچھی تعلیم اور تربیت کرے اور پھر اچھی جگہ شادی کر دے، تو وہ شخص جنت میں جائے گا۔(۱۱)

اس کے بعد سے ماں کی اطاعت وفرماں برداری اور بیوی کے ساتھ حسن سلوک اسلامی معاشرے کا عام وطیرہ بن گیا۔

معاشرتی عدل

﴿۱﴾ اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے۔توحید ایک خدا کو ماننے کا نام ہے۔ایک خدا کے ماننے میں دوسرے خداؤں کا انکار مضمر ہے۔توحید کے بعد غلامی اور عدم مساوات کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے۔

تاریخ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک جملہ اس سلسلے میں محفوظ کر لیا ہے۔مصر کے گورنر اور فاتح حضرت عمرو بن العاص کو انہوں نے لکھا تھا۔

مذکم تعبد تم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا۔(۱۲)

تم نے کب سے ان لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا ہے۔ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

اہل یورپ آزادی کا منشور روسو کے اس جملے کو قرار دیتے ہیں۔

Man was free end be is every where inchain. Those who think themselves masters of other, are indeed greater slaves than they. (13)

حالانکہ اوسو (۱۷۸۱۔۱۷۱۲) سے ہزار سال قبل حضرت عمر (۶۴۴۔۵۸۱) کا قول موجود ہے۔ بہت ممکن ہے روسو نے حضرت عمر کے جملے سے ہی اپنا مفہوم اخذ کیا ہو۔ اس لئے کہ وہ اسلام کی تاریخ سے بخوبی واقف تھا۔ بہرکیف تاریخ میں آزادی کا منشور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے۔

﴿۳﴾ انسان کی غلامی انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ بعثت نبوت کے وقت ہر جگہ غلامی کا رواج تھا۔ یونان کے فلاسفر افلاطون اور ارسطو نے دلائل دے کر ادارۂ غلامی کو مستحکم کر دیا تھا۔ اسلام نے اس قبیح رسم کے خلاف آواز اٹھائی۔ اسلام کا طریقہ کار بڑا حکیمانہ تھا۔ سب سے اوّل آپ ﷺ نے معاشرے میں غلاموں کا درجہ بلند کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

جو تم کھاؤ وہی غلام کو کھلاؤ، جو تم پہنو وہی غلام کو پہناؤ۔

اس حکم نے غلامی کی انقلاب ماہیت کر ڈالی (Meta Morphosis) اس حکم کے بعد یہ حال ہوگیا تھا کہ آقا اور غلام میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس ایک حکم سے ساری نفرت اور حقارت جو غلاموں کے خلاف تھی وہ سب دور ہوگئی۔ یہ قدیم الایام سے ایک معاشرتی ادارہ (Social institution) تھا جس سے ہزارہا نوعیت کے معاشی اور معاشرتی تعلقات اور روابط وابستہ تھے۔ اس لئے آپ نے قانوناً اس کا انسداد کرنے کے مقابلے میں رضا کارانہ آزاد کرنے کی ہر طرح سے ترغیب دی۔ ام ولد کے قانون کے تحت ایک نسل کے بعد ہی غلام زادہ آزاد ہو جاتا تھا۔ اس طرح بتدریج غلامی کا بھی خاتمہ ہوگیا اور نہ معاشی و معاشرتی بحران برپا ہوا۔ اور نہ آزاد کردہ غلاموں سے کوئی نفرت اور انتقام کا جذبہ پیدا ہوا۔ معاشرہ نے ان غلاموں کو تخت سلطنت تک پہنچا دیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں غلام خاندان (۱۲۸۸۔۱۲۰۶) اور مصر کی تاریخ میں مملوک خاندان (۱۵۱۷۔۱۲۵۰) دو روشن مثالیں ہیں۔

امریکہ نے بھی ۱۸۶۳ء میں غلامی کو ممنوع قرار دیا۔ مگر ایک صدی گزر جانے کے بعد آج بھی حبشیوں کے خلاف نفرت موجود ہے۔ آج بھی ان کو معاشرے میں مساوی درجہ حاصل نہیں ہے۔ اور جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت میں سارے سیاہ فام کچھ عرصے پہلے تک غلاموں سے بدتر زندگی بسر کر رہے تھے۔

﴿۳﴾ انسانیت کی تذلیل کا ایک اور طریقہ رنگ اور نسل کی برتری کا تصور ہے۔ اصلاً تو یہ مرض آریہ نسل کا پھیلایا ہوا ہے۔ ہندوستان کا برہمن اور جرمنی کا نازی نسل پرستی میں سب سے پیش پیش ہے۔ اینگلو سیکسن نسل کے لوگ کسی دوسری نسل کو اپنے برابر درجہ دینے کو تیار نہیں ہیں، اسی لئے عظیم مورخ ٹوئین بی کہتا ہے:

رنگ و نسل کی برتری کا مرض ہم نے (انگریز، اینگلو سیکسن) ساری دنیا کو لگایا ہے۔

اسلام سے قبل عرب میں بھی نسل پرست لوگ موجود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف سخت جہاد کیا۔ آپ نے فرمایا:

عرب کو غیر عرب پر اور غیر عرب کو عرب پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو۔ اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی۔ (۱۴)

قرآن مجید کے مطابق بزرگی اور بڑائی کا تعلق تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہے۔ (۱۵) یعنی اعمال سے ہے رنگ و نسل سے نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی اسلامی ریاست میں تمام نسلوں کے لوگوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا۔ آپ نے ایک لشکر کا سپہ سالار ایک حبشی غلام زادہ کو مقرر کر دیا اور انکی ماتحتی میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ جیسے جلیل القدر صحابی اور قریشی النسل عربوں کو دیدیا۔ اس طرح نسلی فخر و غرور کا خاتمہ کیا اور انسانی مساوات کا اصول پیش کیا۔

نماز اگرچہ ایک عبادت ہے۔ معاشرتی فوائد بھی ہیں۔ روزانہ پانچ وقت کی نماز محلہ کی مسجد میں ایک صف میں کھڑے ہو کر پڑھی جاتی ہے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز شہر کی بڑی مسجد میں یکجا پڑھی جاتی ہے۔ سال میں دو مرتبہ عیدین کی نماز سارے شہر کی یکجا پڑھی جاتی ہے۔ اور زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ سارے عالم اسلام کی نماز حج کے موقع پر خانہ کعبہ کے امام کے پیچھے پڑھی جاتی ہے۔ ان نمازوں میں یہ عالم ہوتا ہے کہ:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اس طرح ہر وقت وحدت امت کا سبق (Rehearsal) پڑھایا جاتا ہے۔ یہ نمازیں تمیز رنگ و نسل کے خلاف مسلسل اور پیہم جہاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی طویل تاریخ میں تمیز رنگ و نسل کے فتنہ

نے سر نہیں اٹھایا۔ ورنہ آج بھی متمدن دنیا اس مرض سے خالی نہیں ہے۔ امریکہ اور جنوبی افریقہ کو چھوڑیئے۔ انگلستان جیسے ملک میں ۱۹۴۱۔۱۹۰۰ء میں یہ واقعہ پیش آیا کہ وزیر اعظم ایڈن کی بہن نے افریقہ میں ایک حبشی شاہزادے Kabaka کے ساتھ شادی کرلی تھی۔ اس کے خلاف اتنا ہنگامہ برپا ہوا کہ بالآخر ایڈن کو وزارت سے استعفیٰ دینا پڑا۔

﴿۴﴾ اسلام نے مساوات مرد و زن کا اعلان چودہ سو سال قبل کیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ (۱۶)

عورتوں کے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں۔ جیسے مردوں کے حق ان پر ہیں۔

اسلام سے قبل کسی مذہبی کتاب میں ایسا کوئی اعلان نہیں ہے۔ اہل یورپ نے انیسویں صدی میں مرد و زن کی مساوات کا عقیدہ قبول کیا ہے۔

﴿۵﴾ نکاح کے معاملے میں عورت پر بڑا ظلم ہوتا تھا۔ مرد بہت سی عورتوں سے شادی کر لیتا تھا۔ اس پر کوئی بندش نہیں تھی۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی مرتبہ زیادہ سے زیادہ چار عورتوں کی بندش لگائی۔ اور ان کے درمیان عدل کرنے کی شرط عائد کردی۔ نکاح کو باہمی رضامندی کا ایک معاہدہ قرار دیا۔ جس کو مرد ناگزیر حالات میں طلاق کے ذریعے اور عورت خلع کے ذریعے فسخ کر سکتی ہے۔ نہ مسیحی دنیا میں اور نہ ہندو دنیا میں طرفین کو یہ حق حاصل تھا۔ اب اس صدی میں وہ اسلام کے طریقے کو قبول کر رہے ہیں۔

معاشی عدل

۱۔ اسلام نے صدیوں قبل سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے مفاسد سے بچ کر ایک عادلانہ رفاہی نظام جاری کیا۔

۲۔ اسلام نے سود کو اور احتکار کو حرام قرار دے دیا تاکہ سرمایہ داری کو فروغ حاصل نہ ہو۔

۳۔ دنیا میں سب سے پہلے اسلام نے مالداروں کی آمدنی میں ناداروں اور محتاجوں کے لئے حق مقرر کیا۔

۴۔ زکوٰۃ اور صدقات کے ذریعے چودہ سو سال قبل اجتماعی کفالت کا نظام (Social Security) رائج فرمایا۔

۵۔ ارتکازِ دولت (سرمایہ داری) کے مقابلے میں اسلام نے گردشِ دولت کا نظریہ پیش کیا۔

۶۔ اسلام نے صرف اکلِ حلال کی ترغیب دی اور ہر قسم کی حرام خوری اور کام چوری سے منع فرمایا۔

نظریاتی ریاست

۱۔ دنیا میں سب سے پہلے نظریاتی ریاست اسلام نے قائم کی۔ نسلی بادشاہت قومی اور وطنی تصور ریاست کا خاتمہ کردیا۔

۲۔ تاکہ سابقہ تصورِ ریاست سے کلی امتیاز پیدا ہو جائے، اسلام نے اپنے سیاسی اور حکومتی نظام کے لئے نئی اصطلاحات وضع کیں۔ امت و ملت، خلافت، زکوٰۃ و صدقات، (محصول) جہاد، شہید (مقتول)، وفات (موت)، مالِ غنیمت۔ بیت المال (خزانہ)، شوریٰ (ندوۃ، موتمر)، خلیفہ، امیر (ملک، سلطان)۔

۳۔ دنیا میں سب سے پہلی فلاحی ریاست اسلام نے قائم کی۔ یونان کی شہری ریاستوں میں دو تہائی سے زیادہ آبادی یعنی غلام اور عورتیں ہر قسم کے حقوق سے محروم تھیں۔

۴۔ تاریخ انسانی میں باہمی معاہدے (Social Contract) کے ذریعے اگر کوئی ریاست قائم ہوئی ہے تو وہ مدینہ کی اسلامی ریاست ہے۔ قیامِ ریاست سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے انصارِ مدینہ سے معاہدہ کیا جو بیعت عقبہ ثانی کے نام سے مشہور ہے۔ پھر آپ ﷺ نے مدینہ جا کر یہود یوں سے باقاعدہ معاہدہ کیا، روسو نے معاہدہ عمرانی کا تصور غالباً مدینہ کی ریاست سے اخذ کیا تھا۔ ورنہ تاریخ میں اس کے علاوہ دوسری اور کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔

۵۔ دنیا کی تاریخ میں پہلا تحریری دستور مدینہ میں ۶۲۲ء میں نافذ ہوا۔ جبکہ انگلستان کا دستور ۱۳۱۵ء اور چنگیز خان کا دستور ۱۲۱۸ء میں نافذ ہوا تھا۔ اس دستور میں تقریباً پچاس دفعات تھیں۔

۶۔ خلافت کی بنیاد شوریٰ پر ہوتی تھی۔ خلیفہ عوام کا منتخب اور ان کا معتمد علیہ ہوتا تھا۔ وہ عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا تھا۔ عوام اس کو معزول کرنے کا حق رکھتے تھے۔ شوریٰ (کابینہ) کے طریقے

پر حکومت کرنے کا آغاز سب سے پہلے اسلام نے جاری کیا ہے۔

۷۔ عوام صرف معروف میں خلیفہ کی اطاعت کے پابند تھے۔ غیر معروف اور غیر اسلامی احکام میں خلیفہ کی نافرمانی کی جا سکتی تھی۔ اس لئے کہ درحقیقت اقتدار اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ جس کی اطاعت ہر حال میں کرنا ضروری ہے۔

۸۔ خلیفہ ایک عام شہری کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کو کوئی زائد حقوق حاصل نہیں تھے۔ وہ متقی اور پرہیز گار شخص ہوتا تھا۔ ملکی خزانے پر عام آدمی سے زیادہ اس کا حق نہیں ہوتا تھا۔

۹۔ اسلامی ریاست ہر طرح ایک فلاحی ریاست تھی۔ ایک خادم عوام ریاست تھی۔ ۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں پہلی مرتبہ صوبوں میں جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں۔ کانگریس کے رہنما مسٹر گاندھی نے اس موقع پر کانگریسی وزرا کے نام ایک پیغام جاری کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ہندوؤں کے رام اور کرشنا تو دیومالائی اشخاص ہیں۔ البتہ مسلمانوں کے ابوبکرؓ اور عمرؓ تاریخی شخصیتیں ہیں۔ انہوں نے بادشاہی میں فقیری کی ہے۔ میں ہدایت کرتا ہوں کہ تم ان کی تقلید کرو۔

آزاد عدلیہ

۱۔ اسلام نے قانون (شریعت) کی عملداری (Rule of Law) قائم کی، کوئی فرد بشر قانون سے بالا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ خلیفہ بھی بالا نہیں تھا۔ یہاں (King Can do no wrong) جیسے تصورات کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

۲۔ عدلیہ انتظامیہ کے ماتحت نہیں۔ وہ انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد ہے۔ وہ صرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

۳۔ اسلام سے قبل مقدمات فیصل کرنے کے عجیب عجیب طریقے دنیا میں رائج تھے۔ کہیں غیب دانوں اور کاہنوں کی گواہی پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ ملزم کو صفائی کے لئے آگ میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ یا آگ میں گرم کر کے سرخ لوہے کا گولا ہاتھ پر اٹھانا پڑتا تھا۔ کہیں فیصلہ کا طریقہ یہ تھا کہ فریقین باہم ایک دوسرے پر تلوار سے حملہ آور ہوتے تھے۔ (Dual) جو زندہ بچ جاتا وہ حق پر تصور کیا جاتا تھا۔ ہندوستان اور یورپ میں اس قسم کے طریقے رائج تھے۔

اسلام نے ان تمام طریقوں کو غلط قرار دیا۔ مقدمات کے فیصلے کے لئے لوگوں کی شہادت کو ضروری قرار دیا۔ آج ساری مہذب دنیا میں یہی طریقہ رائج ہے۔

۴۔ اسلام نے سب سے پہلے قتل عمد اور قتل غیر عمد کی تفریق قائم کی۔ ورنہ نہ تو منو کے قانون میں (ہندوستان) اور نہ جسٹینین کے قانون میں (روما) یہ باریک بینی موجود تھی۔

۵۔ قاتل کو قدیم قانون میں ہر جگہ لازماً قتل کی سزا دی جاتی تھی اب جدید یورپ میں قتل کی سزا ہی کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اسلام نے بین بین راستہ قبول کیا ہے۔ اسلام نے خون بہا کے ذریعے قاتل کو معاف کرنے کا طریقہ جاری کیا۔ بشرطیکہ مقتول کے ورثا راضی ہوں۔

علم کی ترغیب

۱۔ دنیا میں سب سے اول حصول علم کو اسلام نے لازمی قرار دیا۔ مردوں کے لئے بھی اور عورتوں کے لئے بھی۔ واضح رہے کہ یونان کا فلسفی ارسطو عورتوں اور غلاموں کو تعلیم دینے کا سخت مخالف ہے۔ ہندوستان کا قانون ساز منو کہتا ہے اگر شودر کے کان میں وید کے الفاظ پڑ جائیں تو اس کو سزا دو اور اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دو۔

۲۔ اسلام نے مدرس کی معلومات پر علم صحیح کی بنیاد رکھی ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ○ (۱۷)

کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو، یقیناً آنکھ کان اور دل سب کی باز پرس ہونی ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ آنکھ کان (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل ہوتی ہیں، اور پھر دل (ذہن) اس کی تصدیق کرتا ہے اس کو مرتب شکل دیتا ہے۔ جدید دور نے علم صحیح کا یہی نظریہ قبول کر رکھا ہے۔ اس آیت نے علم نجوم، کہانت، جادو، غیب دان کے طریقے، سفلی علوم سب کی تردید کر دی۔ اس لئے کہ یہ علم صحیح سے حاصل شدہ نہیں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں یہ سری علوم (Occult Sciences) کبھی فروغ نہ پا سکے۔

۳۔ قرآن مجید نے مظاہرِ فطرت پر غور و خوض کرنے کی ترغیب دی۔ فرمایا:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ۚ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ O (۱۸)

ان سے کہو کہ زمین پر چلو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے۔ پھر اللہ بار دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ O (۱۹)

تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں۔ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنھوں نے اللہ کی ہدایت کو جھٹلایا تھا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ۔ (۲۰)

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے وہ سب کچھ تمہارے لئے مسخر کر دیا جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور کشتی کو بھی جو اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے۔

یہ آیتیں تین باتوں کی تلقین کرتی ہیں۔ علم صحیح کی تلاش، مظاہر کائنات پر غور و خوض، تسخیر کائنات کا ارادہ، یہی تین باتیں سائنسی نقطہ نظر کی تشکیل کرتی ہیں۔ دنیا میں سائنسی نقطہ نظر قرآن مجید نے دیا ہے۔ قرآن مجید کی بتائی ہوئی روشنی پر چل کر عرب بتدریج سائنسی فکر کو پروان چڑھا رہے تھے۔ اس میں اندلس کے عربوں کا حصہ زیادہ تھا۔ مگر ابھی یہ پودا برگ و بار لانے والا ہی تھا کہ اندلس تباہ و برباد ہو گیا۔ پھر یورپ والوں نے اس پودے کو پروان چڑھایا۔ بیکن، کوپرنیکس، نیوٹن کی اصل کتابوں کا مطالعہ کیجئے، یہ سب عربوں کے احسان مند ہیں۔

حقوقِ انسانی

۱۔ انسان کے بنیادی حقوق کا واضح اعلان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کے موقع پر آخری خطبہ میں فرمایا۔ حجۃ الوداع کا خطبہ حقوق انسانی کا منشور ہے۔ اس سے قبل حقوق انسانی کا

واضح اعلان کسی مفکر کی تعلیمات میں نہیں ملتا۔

۲۔ آج کے دور میں حقوق کی ضمانت ریاست دیتی ہے۔ ریاست متلون مزاج اور تغیر پذیر افراد کا ادارہ ہے۔ اس وجہ سے بعض اوقات افراد اپنے حقوق حاصل کرنے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف اسلام ان حقوق کی پابجائی کے لئے اللہ اور رسول ﷺ کی ضمانت دیتا ہے۔ جو شخص بھی ایمان رکھتا ہے اس کا فریضہ ہے کہ وہ ان حقوق کو ادا کرے۔ اس طرح اسلامی طریقہ میں تغیر پذیر سیاسی مصلحتیں مانع نہیں بن سکتی ہیں۔ یہ ضمانت اقوام متحدہ کی ضمانت سے بھی زیادہ قوی ہے۔

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں بلکہ دورِ زوال میں بھی جس اخلاقی بلندی کا مظاہرہ کیا ہے اور جس طرح حقوقِ انسانی کی پاسداری کی ہے۔ اس کی گرد کو بھی وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے، جو آج تہذیب و شائستگی کے علم بردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کے لوگوں نے افریقہ، امریکہ، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک روا رکھا ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی ہے۔ یہ قرآنی تعلیمات کی ہی برکت تھی کہ جس نے مسلمانوں کے اندر اتنی انسانیت پیدا کردی کہ وہ اقتدار اور غلبے کے دور میں بھی اتنے ظالم نہ بن سکے جتنے کہ غیر مسلم تاریخ کے ہر دور میں نظر آتے ہیں۔

کوئی شخص آنکھیں رکھتا ہے تو خود دیکھ سکتا ہے کہ اسپین میں جب مسلمان صدیوں حکمران رہے تو اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیسا سلوک تھا۔ اور جب عیسائیوں کو وہاں غلبہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے کس طرح مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ اور بالآخر وہاں مسلمانوں کا بیج تک نہ چھوڑا۔ بیت المقدس جب صلیبی سورماؤں نے فتح کیا تو کس قدر خوں ریزی کی اور بیت المقدس جب صلاح الدین نے فتح کیا تو کس قدر رحمدلی کا مظاہرہ کیا۔ گزشتہ صدیوں میں مسلمان حکومتوں کا یہودیوں کے ساتھ کیا رویہ رہا؟ اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہے۔ ہندوستان کے آٹھ سو سالہ دورِ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ اور اب آزاد ہو جانے کے بعد ہندوؤں نے کس قدر مسلمانوں کی خوں ریزی کی ہے۔

یورپ کے مستشرقین نے اسلامی تہذیب کے ورثہ کو کندی، فارابی، ابن سینا، ابن رشد، رازی وغیرہ مسلمان حکما کی تعلیمات تک محدود سمجھ لیا ہے۔ اسلامی ورثہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ بلکہ حقیقت تو

یہ ہے کہ موجودہ مہذب دنیا جن اقدار حیات پر ایمان رکھتی ہے۔ مثلاً! عالم انسانیت کی مساوات، مساوات مرد و زن، مذہبی رواداری، علم صحیح کی لگن، محنت کی قدر اور جن طریقوں سے نفرت کرتی ہے مثلاً نفس کشی، غلامی، امتیاز رنگ و نسل وغیرہ، اگر ان اقدار حیات کا شجرہ نسب تلاش کیا جائے تو وہ عرب کے نبی امی ﷺ کی تعلیمات میں ملے گا۔ نبی عربی کی تعلیمات سے قبل کہیں بھی ان اقدار حیات کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ درحقیقت یہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان کا چشمہ ہے جس سے سارا عالم مستفید ہو رہا ہے۔

آج ان ذروں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے
تیرے در کا نقش سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے

حوالہ جات

۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۳۱،
۲۔ سورۂ بقرہ آیت ۳۸، ۳۹،
۳۔ سورۂ رعد، آیت ۷،
۳۔ الف۔ ترمذی، کتاب القدر، رقم ۲۱۴۵
۴۔ Vol VII, P 576.
۵۔ ابن کثیر
۶۔ سورۂ کہف آیت ۲۹
۷۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۵۶،
۸۔ مستدرک حاکم، بیروت، ۲/۷۰،
۹۔ سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۲۳
۱۰۔ ترمذی، بیروت، ۲/۳۸۷/۲، رقم ۱۱۶۵،
۱۱۔ ابو داؤد، بیروت، ۴/۵/۳۷، ت رقم ۵۱۴۷،
۱۲۔ شبلی نعمانی / الفاروق / ج ۲/ص ۵۵۲،
۱۳۔ Social Contract, P 49
۱۴۔ مجمع الزوائد، بیروت، ۳/۲۶۶،
۱۵۔ سورۂ حجرات آیت ۱۳
۱۶۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸،
۱۷۔ سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۳۶،
۱۸۔ سورۂ العنکبوت آیت ۲۰،
۱۹۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۷،
۲۰۔ سورۂ حج، آیت ۶۵،

زکوٰۃ اور رفاہِ عامہ

تعلیماتِ نبویؐ کی روشنی میں

اسلام کا تصورِ دین

زکوٰۃ کو سمجھنے سے قبل اسلام کا تصورِ دین سمجھنا ضروری ہے۔ دنیا کے سارے ہی مذاہب کا مرکزی تصور بندے اور رب کے درمیان رابطہ بحال کرنا ہے۔ ان کے نزدیک انسانی روح اپنے مرکز (اللہ تعالیٰ) سے جدا ہو کر دین میں آ گئی ہے۔ یہاں آ کر مادیت میں پھنس گئی (جسم) اور آلائشوں میں ملوث ہو گئی ہے۔ اس لئے ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ گیان دھیان، توجہ و اشراق، مراقبے و مجاہدے کے ذرائع استعمال کر کے روح کو پاکیزہ بنا لیا جائے۔ تاکہ وہ حضورِ حق میں پیش ہونے کے قابل بن سکے۔ اس کوشش میں دنیا کی معاشرتی اور تمدنی زندگی ان کے لئے ایک جھنجھٹ ہے۔ اس سے جس قدر بچا جا سکے اسی قدر بہتر ہے۔

اسلام حقیقت کا ادراک ایک دوسرے انداز سے کرتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جذبہ رحمت اور ربوبیت کے تحت یہ عظیم الشان وسیع الاطراف کائنات تخلیق کی ہے۔ یہاں کی ساری مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات، اور ملائکہ۔ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام اور ضابطے کے پابند ہیں۔ سب مامور ہیں۔ سب مجبور ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت نے چاہا کہ ایک اور مخلوق پیدا کرے۔ جو آزاد و خودمختار ہو۔ وہ اپنے آزاد ارادے سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کرے۔ وہ آزاد اور

خودمختار مخلوق انسان ہے۔اس لئے کہ آزاد و خودمختار کی اطاعت وفرماں برداری، مجبور و مامور کی اطاعت و فرماں برداری سے افضل ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ارادے اور اختیار کی آزادی بخشی ہے۔عقل وفہم کی قوتیں عطا کی ہیں۔کارخلافت کی انجام دہی میں جس قدر اسباب و وسائل درکار ہو سکتے تھے، وہ سب مہیا فرما دیئے۔دنیا کی ساری نعمتوں کو اس کے ارادے کا تابع بنا دیا۔مہلت حیات عطا فرمادی۔اب اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسان ارادے اور اختیار کی آزادی کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔دنیا کی ان ہزارہا نعمتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔دنیا میں انسان دراصل ایک آزمائش اور ایک امتحان میں ہے۔صلاحیتوں اور استعدادوں کا امتحان ہے۔صلاحیتیں پڑی زنگ کھا رہی ہیں یا ان کا استعمال کر رہا ہے۔ان وسائل کو راہ حق میں استعمال کر رہا ہے یا خودغرضی اور نفسانیت کی راہ میں استعمال کر رہا ہے، اور دنیا کو اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ''مصیبت کا گھر'' بنا رہا ہے۔یہ بڑا امتحان ہے۔

صلاحیتوں کا استعمال ارادے واختیار کا استعمال ہے۔اس کے دو رخ ہیں۔ایک تو ان کو حق و ناحق کے معیار پر جانچا جا رہا ہے جس کا اجر و ثواب یا عذاب آخرت میں ملے گا۔دوسرے ان محنتوں اور کوششوں کے نتیجے میں علوم وفنون، تہذیب وتمدن آرام وخوشحالی فروغ پا رہی ہیں۔اسلام کا تصور دین علوم وفنون کی ترقی، تمدن و معاشرت کے ارتقا، خوشحالی و فارغ البالی کی ضمانت کا ذمہ دار اور آئینہ دار ہے۔

اس کائناتی منصوبے میں انسان جسم و جان اور مال و دولت سب کا امتحان دے رہا ہے۔انسان (مسلمان) جہاں اللہ تعالیٰ کے حضور بدنی عبادت، روزہ ونماز، پیش کر رہا ہے۔وہاں مالی عبادت، زکوٰۃ اور حج بھی پیش کر رہا ہے۔زکوٰۃ دین اسلام کا اہم رکن ہے۔زکوٰۃ اسلامی عبادت ہے۔

زکوٰۃ اور قدیم انبیا

قرآن مجید بتاتا ہے کہ انبیاء ماسبق کے دین میں بھی زکوٰۃ کا رکن شامل تھا، سورۂ انبیا میں حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کا ذکر آیا ہے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ (۱)

اور ہم نے وحی کے ذریعے ان کو نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت کی۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔

وَكَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ص (۲)

اور وہ اپنے اہل وعیال کو نماز کا اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے متعلق فرماتے ہیں:

وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا O (۳)

اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا ہے، جب تک میں زندہ رہوں۔

زکوٰۃ اور مکی زندگی

زکوٰۃ اوّل روز سے اسلام کا رکن ہے۔ مکی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آزادانہ اپنی دعوت پیش کرنے کی آزادی حاصل نہیں تھی اور اسلام کے ارکان پر برملا عمل نہیں رہ سکتے تھے۔ اس دور کی سورتوں میں زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ O (۴)

اور ان کے مالوں میں حق ہے سائل کے اور محروم کے لئے۔

ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ O لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ O(۵)

جن کے مالوں میں سائل کا اور محروم کا حق مقرر ہے۔

بلکہ لفظ زکوٰۃ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ کافروں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ O الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ O (۶)

کافروں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تباہی ہے ان مشرکین کے لئے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں۔

کی زندگی میں مسلمانوں کا ایک گروہ ہجرت کر کے حبشہ گیا تھا۔ وہاں بادشاہ کے سامنے اسلام کا تعارف کراتے وقت حضرت جعفر بن ابی طالب نے ایک تقریر کی تھی۔ اس میں بھی ادائیگی زکوٰۃ کا ذکر کیا ہے۔

زکوٰۃ اور مدنی زندگی

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست قائم کردی۔ اسلامی معاشرے کی بنیادیں مستحکم کیں۔ اسلامی عبادات کا نظام نافذ کیا اس دور میں زکوٰۃ کا پورا نظام پوری تفصیلات کے ساتھ جاری ہوا۔

نقشہ آمدنی زکوٰۃ

نمبر شمار	نام جنس	کتنی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے	شرح زکوٰۃ	کب فرض ہوتی ہے
۱۔	مال دولت۔	چاندی ۵۲½ تولہ	۲½ فیصد	سال کے بعد
	سونا چاندی سونا ۷½ تولہ	۲½ فیصد	سال کے بعد	
۲۔	زرعی پیداوار، بارانی	۳۰ من غلہ	۵ فیصد	فصل کے موقع پر
	// ، چاہی، نہری	۳۰ من غلہ	۱۰ فیصد	فصل کے موقع پر
۳۔	معدنیات و دفینہ	.....	۲۰ فیصد	برآمدگی پر
	حیوانات مختلف جانوروں پر مختلف شرح سے مختلف جانوروں پر مختلف شرح سے			
۴۔	صدقۃ الفطر	صاحب زکوٰۃ کے ہر فرد بشر پر	نصف صاع ۲ سیر گندم تقریباً،	سال کے بعد

زکوٰۃ جمع کرنا اور پھر اس کو مستحقین میں تقسیم کرنا اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔
مستحقین زکوٰۃ کی مدات بھی قرآن مجید نے متعین کردی ہیں وہ یہ ہیں۔

مستحقین زکوٰۃ کی مدات

قرآن کریم کا ارشاد ہے،

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ۔ (۷)

زکوٰۃ تو حق ہے فقرا و مساکین، عاملین، زکوٰۃ، مؤلفۃ القلوب، غلاموں، مقروضوں، اور مسافروں کا، یہ اللہ کا عائد کردہ طریقہ ہے۔

اسکی تشریح یہ ہے۔

۱۔فقرا و مساکین: معاشرے کے وہ افراد جو معاشی دوڑ میں گر گئے، ان کی دستگیری کرنا۔

۲۔عاملین: زکوٰۃ وصول کرنے والے کارکنوں کی تنخواہیں ادا کرنا۔

۳۔مؤلفۃ القلوب: نومسلم جو اپنا خاندان اور معاشرہ ترک کرکے نئے معاشرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ان کو بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایسے افراد کی امداد کرنا۔

۴۔غلام: زکوٰۃ سے ان کی امداد کرنا تاکہ وہ اپنی آزادی خرید سکیں۔

۵۔مقروض: مقروض افراد کی امداد کرنا تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔

۶۔فی سبیل اللہ: اللہ کے نام پر، یعنی جہاد اور بھلائی کے اجتماعی کاموں پر خرچ کرنا۔

اب تک کی تمام مدات انفرادی بھلائی کی تھیں۔

۷۔ابن السبیل: قدیم زمانہ میں تو مسافر بہت ہی بے بس ہو جاتا تھا۔آج بھی بعض دفعہ مسافر امداد کا محتاج بن جاتا ہے۔

واضح رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے مستحقین میں سے اولاد عبدالمطلب کو خارج کر دیا۔سیّدوں پھر علویوں پر، عباسیوں پر زکوٰۃ حرام ہے۔یہ آپ نے اس لئے کیا کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ وہ اپنی اولاد اور خاندان کے لئے جاگیر بنا گئے تھے۔جیسا کہ برہمنوں کا حال ہے، اس صورت میں یہ لوگ

سیدوں کو دینے کو ترجیح دیتے۔

نظام زکوٰۃ میں آمدنی کی مدات بھی متعین ہیں۔اور مستحقین زکوٰۃ کی مدات بھی نص قرآن سے متعین ہیں،ان میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔پھر مصارف کی فہرست میں ایک مدکارندوں کی ہے۔اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی آمدوخرچ کا حساب عام حکومتی حسابات سے جداگانہ رکھنا چاہئے۔ایک زکوٰۃ بورڈ ہے جو زکوٰۃ کے معاملات کا کلی طور پر مختار ہو۔اور بغیر کسی دباؤ اور مداخلت کے وہ اپنا کام کرے۔

زکوٰۃ کے امتیازات

زکوٰۃ عبادت ہے۔جس طرح عبادت کا انکار کرنے والا دائرہ دین سے خارج ہوجاتا ہے،اسی طرح زکوٰۃ کا انکار کرنے والا اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔اس کے خلاف جہاد جائز ہے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا۔

زکوٰۃ میں اور ٹیکس میں فرق ہے۔ٹیکس کل آمدنی پر لگتا ہے۔اس لئے ٹیکس کی چوری کرتے ہیں، اور کوئی بھی خوش دلی سے ادا نہیں کرتا۔زکوٰۃ بچت پر عائد ہوتی ہے۔اس کو لوگ خوش دلی سے ادا کرتے ہیں۔چوری کرنا تو کجا لوگ کچھ زائد ہی دیتے ہیں۔اس سے ذہن میں للّٰہیت پیدا ہوتی ہے۔

بعض مغربی ممالک میں عمومی کفالتی اسکیم Social Security Scheme نافذ ہے۔ ان اسکیموں میں لوگ پہلے ممبر بنتے ہیں۔ماہانہ چندہ ادا کرتے ہیں۔تب حادثات کی صورت میں یا ضعیفی کی حالت میں فنڈ سے ان کو امداد ملتی ہے۔لیکن جو ممبر نہیں ہوتے ان کو امداد نہیں ملتی۔زکوٰۃ میں اصول یہ ہے کہ مالداروں سے یہ وصول کی جاتی ہے اور غریبوں فقیروں کو ادا کی جاتی ہے۔

توخذ من اغنیاء هم فترد علی فقراء هم ۔(۸)

مالداروں سے وصول کی جاتی ہے اور نادار وں میں تقسیم کی جاتی ہے۔

زکوٰۃ کے پس پردہ معاشی حکمت یہ کارفرما ہے کہ زر ہمیشہ گردش میں رہے،کسی جگہ جمع نہ ہو، اکتناز ہو۔گردش زر سے معاشرہ کے تمام ہی طبقات اور تمام افراد مستفید ہوتے رہتے ہیں۔اور اکتناز سے صرف دولت مند طبقہ مستفید ہوتا رہتا ہے۔زکوٰۃ گردش زر کا ذریعہ بنتی ہے۔اور سود اکتناز زر کا ذریعہ بنتا ہے۔اس لئے اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔

زکوٰۃ اور تشکیل ذہنیت

دنیا کی ساری اقوام کم و بیش مال کی محبت میں مبتلا ہیں۔ ہندو سال میں ایک مرتبہ تہوار مناتے ہیں، جس کو دیوالی کہتے ہیں۔ جس میں دیے روشن کیے جاتے ہیں۔ اس میں دولت کی دیوی لکشمی کی پوجا کی جاتی ہے۔ یونانی بھی دولت کی دیوی میمن Mammon کی پرستش کرتے تھے۔ بقیہ قوموں کا بھی ایسا ہی کچھ حال ہے۔ اس سے بخل، خودغرضی اور تنگ نظری کی ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ یہودیوں کی کنجوسی اور خود غرضی کو شیکسپیر نے شائلوک کے کردار میں عریاں کر دیا ہے۔ ہندوؤں کے متعلق بھی ضرب المثل مشہور ہے۔ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے۔

جس طرح جسم کو امراض لاحق ہوتے ہیں اسی طرح نفس انسانی کو بھی امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ نفسانی امراض میں مال و دولت کی محبت سب سے زیادہ مہلک مرض ہے۔ ایسا شخص دین و اخلاق، ملک و ملت سب کو مال کی محبت پر قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

حب الدنیا رأس کل خطیئۃ۔ (۹)

تمام برائیوں کی جڑ مال کی محبت ہے۔

زکوٰۃ سے ذہن میں پاکیزگی اور فراخی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ۔ (۱۰)

اے نبی (ﷺ) آپ ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کریں، اور (نیکی کی راہ میں) انہیں آگے بڑھائیں۔ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کریں۔

زکوٰۃ سے ذہن و فکر میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ فراخ دستی اور کشادہ نظری پیدا ہوتی ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ بے شک یہ دولت تم نے ہی کمائی ہے لیکن اس کے اندر معاشرے کے ناداروں اور فقیروں کا بھی حق ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (۱۱)

قرآن مجید یہاں خیرات یا صدقات کا لفظ استعمال نہیں کرتا، بلکہ حق کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ تبدیلیٔ لفظ سے قرآن کا نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ ان احکام کے بعد مسلمان معاشرے کے دولت مندوں اور مالداروں کی ذہنیت ایک دوسرے ہی انداز پر تشکیل پذیر ہوتی تھی جو دوسرے معاشروں کے مالداروں کی ذہنیت سے مختلف تھی۔ مسلمان مالدار کبھی غربا، مساکین، یتیم اور بیواؤں کے ماہانہ وظیفے جاری کرتے تھے۔

کبھی یتیموں اور نادار بچوں اور بچیوں کو اپنے گھر میں اپنی اولاد کی طرح پالتے اور پوستے تھے۔ کبھی اپنے بچے کے ساتھ محلے کے نادار وں کی بھی مفت تعلیم کا انتظام کرتے تھے۔ ان بچوں کو مزید تعلیم کے وظائف دیتے تھے۔ اس طرح نادار بچے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتے تھے۔ ہر کار خیر میں محلے کے اہل خیر پیش قدمی کرتے تھے۔ اس طرح محلے کے امیر اور غریب کے درمیان باہمی تعاون کی فضا رہتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے ہمدرد اور معاون ہوتے تھے۔ یہ ساری ذہنیت زکوٰۃ کی پیدا کردہ تھی۔ آج سے ۶۰۔۷۰ سال قبل بھی ایسا امرا ہمارے معاشرے میں موجود تھے۔ ان کے دیکھنے والے ابھی موجود ہیں۔

اس کے برخلاف آج کا امیر اپنی دولت میں کسی کا حق ماننے کو تیار نہیں۔ وہی خود غرضی کا سودا دماغ میں سمایا ہوا ہے۔ غریبوں سے کٹ کر جدا بستی میں رہتا ہے۔ جدا اسکولوں میں اس کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ معاشرت جدا، حلقۂ احباب جدا، غربا و مساکین کی ہمدردی اور امداد کا کوئی تصور ہی نہیں۔ اس کی وجہ سے امرا اور غربا آپس میں کٹ گئے۔ دونوں کے دلوں میں محبت کے بجائے نفرت و حقارت کے جذبات موجزن رہتے ہیں۔ جن کو اغراض پرست لوگ بھڑکا دیتے ہیں۔

زکوٰۃ نے مسلمان قوم کی ذہنیت ایک خاص نہج پر استوار کی۔ وہ فراخ دست ہوتا ہے۔ مہمان نواز ہوتا ہے۔ دوسروں کے کام کرنے والا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

خیر الناس من ینفع الناس۔ (۱۲)

بہترین انسان وہ ہے جس سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔

آج دنیا کی قوموں میں مہمان نوازی صرف مسلمانوں کا امتیاز ہے۔ بعض قومیں ہندو اور چینی اور یورپی تو اس سے بالکل واقف نہیں ہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ میں جو کردار سب سے زیادہ قابل مذمت رہا ہے وہ ہے بخیل

بخیل اربود مالک بحر و بر
بہشتی نہ باشد بحکم جز

جو کردار سب سے زیادہ قابل تحسین رہا ہے وہ ہے سخی۔ سخی حبیب اللہ کا جملہ عام طور پر بولا جاتا ہے۔ اور کئی اشعار ایسے موقع پر پڑھے جاتے ہیں۔

تو نگری بدل است نہ بہ مال
بزرگی بعقل است نہ بہ سال
منعم بہ کدہ دست و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت، خیمہ زدو بارگاہ ساخت

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سورۂ انبیا، آیت ۷۳،
۲۔ سورۂ مریم، آیت ۵۵،
۳۔ سورۂ مریم، آیت ۲۱،
۴۔ سورۂ ذاریات، آیت ۱۹،
۵۔ سورۂ معارج، آیت ۲۴، ۲۵،
۶۔ سورۂ حم سجدہ، آیت ۷،
۷۔ سورۂ توبہ، آیت ۶۰،
۸۔ بخاری، کتاب الزکاۃ، باب ۶۳،
۹۔ علی متقی الہندی، کنز العمال، رقم الحدیث ۶۱۱۴،
۱۰۔ سورۂ توبہ آیت ۱۰۳،
۱۱۔ سورۂ ذاریات، آیت ۱۹
۱۲۔ کنز العمال، ۴۴۱۴۵،

قلوپطرہ®

روشن اور خوبصورت آنکھوں کے لئے

CLEOPATRA®

سُرمہ۔سُرمی۔کاجل

MANUFACTURES:
SHAMSI INDUSTRIAL COMPANY
® REGISTERD TRADE MARK.

سیرت طیبہ ﷺ کا مطالعہ عہدِ جدید میں کس طرح ہماری رہنمائی کرتا ہے؟

۱۹۷۴ء میں پاکستان مسلم یوتھ کلب، کراچی کے زیر اہتمام درج بالا عنوان کے تحت ایک مذاکرہ منعقد ہوا تھا، اس میں پروفیسر سید محمد سلیمؒ نے سوالات کے جوابات دیئے تھے، ذیل میں مذاکرے میں کئے گئے سوالات اور ان کے جواب پیش کئے جارہے ہیں۔(ادارہ)

سوال ﴿۱﴾ سیرت طیبہ ﷺ کا مطالعہ عہدِ جدید میں کس طرح ہماری رہنمائی کرتا ہے؟

جواب: عہدِ جدید میں تہذیب وتمدن کی خیرہ کن چمک دمک دیکھ کر عام آدمی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا ہے کہ آج کا انسان کوئی نئی مخلوق بن گیا ہے۔اس لئے آج پرانی باتیں چنداں مفید نہیں ہیں۔مگر حقیقت بین لوگ جانتے ہیں کہ یہ مغالطہ ہے اور سراب ہے۔آج کا انسان بھی وہی قدیم انسان ہے۔بلاشبہ اس نے خارجی دنیا میں عظیم الشان فتوحات حاصل کی ہیں۔تہذیب وتمدن میں حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں۔لیکن انسان کی داخلی زندگی آج بھی وہی ہے جو ہزاروں سال پیشتر تھی۔نفرت وعداوت، بغض وحسد، وحشت و بربریت یا محبت واخوت، ایثار وقربانی، صدق وخلوص کسی چیز میں بھی کمی نہیں آئی ہے۔ہر لحاظ سے یہ وہی قدیم انسان ہے۔آدم کے بیٹے پہلے مکوں یا پتھروں سے لڑے ہوں گے، پھر تیر وتلوار سے لڑنے لگے، پھر توپ وتفنگ کا زمانہ آیا، آج میزائل اور ایٹم بم کا دور ہے۔لڑنے کے ہتھیار ضرور تبدیل ہوتے رہے لیکن

جذبۂ جنگ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج کا انسان پہلے سے شدید ترین خونریزی کے ساتھ جنگ لڑتا ہے۔

نہ تم بدلے، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبار انقلاب آسماں کرلوں

انسانیت کے بنیادی مسائل آج بھی وہی ہیں جو کل تھے۔ ان میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

خدا بھی ایک، رسول بھی ایک، کائنات بھی ایک
حدیث بے خبراں ہے قصۂ قدیم و جدید
(اقبال)

انسان کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس کو دنیا میں امن و امان میسر ہو۔ سکون و طمانیت حاصل ہو، وہ معاشرہ جس کا وہ رکن ہے وہ اس کا غمگسار اور ہمدرد ہو۔ عدل و انصاف ہو، حریت و مساوات ہو، فرد اور معاشرے میں باہم ہم آہنگی ہو۔ ایسے معاشرے میں وہ خلیفۃ اللہ فی الارض بن کر رہے۔ مقصدِ حیات گم کر دینے کے بعد انسان کوئی ایسا معاشرہ نہیں تخلیق کر سکا جس میں مذکورہ بالا اقدارِ حیات کا حصول ممکن ہو۔ جس درجہ میں مقصدِ حیات کا شعور کسی معاشرے کے افراد کے ذہن میں اجاگر ہوگا۔ اسی قدر وہ معاشرہ ان اقدارِ عالیہ سے متمتع ہوتا رہے گا۔ مقصدِ حیات اور اقدارِ عالیہ کا سبق بھٹکی ہوئی انسانیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام میں مل سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۱)

(زندگی گزارنے کا طریقہ) اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

معاشرے میں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ہزار گونہ مختلف تعلقات میں مربوط ہوتا ہے۔ جن سے مفر ممکن نہیں ہے۔ بلکہ ان کو نبھانا ہے۔ خود انسان کے جذبات و احساسات، احتیاجات و خواہشات میں بھی بڑا تنوع ہے۔ جگہ جگہ اغراض و مفادات اور خودی کا تصادم ہوتا رہتا ہے۔ باہم ترجیح رہنا اعتدال پر رکھنا حددرجہ نازک اور دشوار کام ہے۔ کوئی نظری فلسفہ یا سائنس ان مسائل کو حل نہیں کر سکتی ہے۔ یہ باہمی برتاؤ کا مسئلہ ہے۔ اور عملی طریقے سے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے عملی نمونہ چاہئے، عالم انسانیت میں ایک ہی کامل نمونہ ہے۔ وہ ہے ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ O (۲)

آپ ﷺ اخلاق کے عظیم درجے پر فائز ہیں۔

دوسرے مقام پر فرماتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تمہارے لئے بہترین نمونہ زندگی ہے۔

اب جہاں کہیں بھی انسانی آبادی پائی جاتی ہے۔اور انسانی معاشرہ موجود ہے۔وہاں اقدار عالیہ کے حصول کے لئے اور باہمی رفاقت کی زندگی بسر کرنے کے لئے دین محمد ﷺ کی پیروی اور سیرت الرسول ﷺ کی اتباع ناگزیر ہے۔آپ کی رہنمائی تمام عالم کے لئے ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (۴)

اے رسول ﷺ ہم نے آپ کو تمام جہانوالوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

سوال نمبر﴿۲﴾ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی تاریخ میں جو عظیم انقلاب برپا کیا ہے۔وہ انقلاب فرانس،روس،اور چین کے مقابلے میں کن بنیادوں پر مفید تر کہا جاسکتا ہے؟

جواب: انقلاب فرانس شاہی طرز حکومت کی ستمرانیوں کے خلاف ردعمل تھا۔اس نے بادشاہ پرستی کا خاتمہ کردیا،انقلاب روس سرمایہ پرستی،کلیسا کی اجارہ داری اور زارشاہی کے مظالم کے خلاف ردعمل تھا۔اس نے۔

لا کلیسا، لاسلاطین لا الہ

کا نعرہ بلند کیا انقلاب چین بنیادی طور پر انقلاب روس کا ہی چربہ ہے۔جزئیات میں فرق ہے۔ روس اور چین کی آپس کی ناچاقی بالکل اس طرح ہے جس طرح کلیسا کے مختلف فرقوں میں اختلافات برپا ہیں۔

نازی انقلاب جرمنی کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے جو وحدت نسل کے اصول پر برپا ہوا تھا۔ اگرچہ ہٹلر کو جرمنی میں شکست ہوگئی اور وہاں یہ انقلاب ناکام ہوگیا۔مگر دنیا میں ابھی تک اس نظریہ کے ماننے والے موجود ہیں اس لئے اس کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

قطع نظر اس بات سے کہ ان انقلابات سے مزعومہ نتائج برآمد ہوئے یا نہیں۔قطع نظر اس بات سے کہ فی الواقع جمہوریت ہر حال میں افضل ہے۔یا سرمایہ کاری ہر حال میں مذموم ہے۔یا نسلی برتری کا تصور صحیح ہے؟ فی الحال ہم ان سوالات کو نظر انداز کردیتے ہیں۔اور ان انقلابات کے دعوؤں کو تسلیم کرلیتے

ہیں۔

۱۔ ہم کسی جزیرے میں ایسے معاشرے کا تصور کرتے ہیں جہاں انقلاب فرانس کے لائے ہوئے تمام مقاصد پوری طرح موجود ہیں۔ نہ وہاں بادشاہت ہے نہ طبقۂ اشراف۔ وہاں جمہوریت اور مساوات ہے۔ گویا روسو اور وولٹیئر کے نقطۂ نظر سے وہ جزیرہ ان کی جنت موعودہ ہے۔ مگر میں پوچھنا چاہتا ہوں کیا وہاں خود غرضی اور نفس پرستی، رشک و رقابت کے جذبات ختم ہو جائیں گے؟ کیا وہاں طاقتور کمزور پر ظلم کرنا بند کر دے گا؟ کیا عیار لوگ سادہ لوگوں کو بیوقوف نہیں بنائیں گے؟ کیا وہاں لوٹ کھسوٹ بند ہو جائے گی؟ کیا وہاں فتنہ و فساد کا دروازہ بند ہو جائے گا؟ کیا جنگ و جدل ختم ہو جائیں گے؟ جمہوریت اور مساوات کے آ جانے سے کیا انسان بدل جائے گا؟ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو وہ انسانی فطرت سے نابلد ہے۔ اور محض کورا ہے۔

۲۔ ہم کسی دوسرے جزیرے میں ایسے معاشرے کا تصور کرتے ہیں جہاں اشتراکیت کی تمام اقدار روبعمل ہیں۔ نہ بادشاہ نہ ادارہ، نہ سرمایہ داری نہ مذہبی اجارہ داری، نہ بیرونی مداخلت، کامل مساوات ہے۔ معاشی وسائل میں سب برابر ہیں۔ ہر شخص کے پاس ایک ایکڑ زمین کاشت کے لئے موجود ہے۔ ایک گائے دودھ کے لئے مہیا ہے۔ ایک مکان رہائش کے لئے میسر ہے۔ ایک بیوی بھی ہے۔ غرض تمام ضروریات پوری ہیں۔ ان میں کامل مساوات ہے۔ گویا یہ مارکس اور انجلز کی جنت موعودہ ہے۔ مگر میں سوال کرتا ہوں کیا وہاں طاقتور آدمی کمزور کی گائے پر قبضہ نہیں کرے گا؟ کیا کوئی کاشتکار پڑوسی کی زمین پر قبضہ نہیں کرے گا؟ کیا کوئی شخص دوسرے کی بیوی کو اغوا نہیں کرے گا؟ بغض و حسد، رشک و رقابت، نفرت و عداوت کے تمام جذبات کیا وہاں سرد پڑ جائیں گے؟ کیا صرف معاشی وسائل کی مساوات سے انسان بدل جائے گا؟ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ انسانی فطرت سے ناواقف ہے۔

۳۔ ہم کسی تیسرے جزیرے میں ایسے معاشرے کا تصور کرتے ہیں جہاں قوم پرستوں کے تمام مقاصد پورے کے پورے موجود ہیں، وہاں ایک ہی نسل اور ایک ہی خون کے لوگ آباد ہیں۔ ایک جیسا ان کا رنگ ہے ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ کوئی غیر قوم یا غیر زبان بولنے والا وہاں موجود نہیں ہے۔ گویا یہ فشٹے اور ٹریٹش کے کی جنت موعودہ ہے۔ مگر میں سوال کرتا ہوں بغض و کینہ، حسد و غرض کے جذبات کہاں چلے جائیں گے۔ لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری کیسے ختم ہو جائے گی۔ اغوا اور بدکاری کیوں ختم ہو جائے گی۔ فتنہ و فساد کیوں سر نہیں اٹھائیں گے؟ کیا وہاں انسان فرشتہ بن

جائے گا؟ صرف اتنی سی بات سے کہ وہاں ایک ہی نسل کے لوگ آباد ہیں؟ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو وہ جنت الحمقا میں بستا ہے۔

جو لوگ سوشلزم اور قوم پرستی کو انسانی مصائب کے درماں کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ وہ بیچارے ناڑی حکیموں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو ہر مرض کا علاج لیپ اور ضماد سے کرتے ہیں، خواہ مرض مالیخولیا ہو یا خفقان، ان بیچاروں کو خبر ہی نہیں کہ انسان کے مسائل اصلی کیا کیا ہیں۔ واضح رہے کہ انسان کا اصلی مسئلہ اس کو انسان بنانا ہے۔ ایک شریف اور معقول انسان بنانا ہے۔ خارجی سے زیادہ یہ داخلی مسئلہ ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے افراد کی تربیت کی جائے۔ ان کے افکار کی تطہیر کی جائے۔ ان کے اعمال کو صالح بنایا جائے۔ پھر ان تربیت یافتہ افراد سے ایک صالح معاشرہ برپا کیا جائے۔ جس میں مقاصد عالیہ کا حصول ممکن ہو۔ مذکورہ بالا نظاموں میں افراد کی اخلاقی تربیت میں، اصلاح معاشرہ کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک قسم کا ظلم و جور ختم کر کے دوسری قسم کا ظلم و جور جو پہلے سے بدتر ہے رائج کر دیتے ہیں۔ افکار کی تطہیر کا بہترین لائحہ عمل اسلامی عقائد اور تعلیمات ہیں۔ اور اعمال کی تحسین اتباع رسول ﷺ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اس لئے جس جگہ بھی صالح معاشرہ برپا ہوگا وہ دین اسلام کے مطابق اتباع رسول ﷺ میں قائم ہوگا۔ انقلاب فرانس، انقلاب روس، انقلاب چین اور نازی انقلاب انسان کے بنیادی مسائل کو حل نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ یہ طوفان بالا ہی بالا گزر جاتا ہے۔ یہ صرف اسلامی انقلاب ہے جو انسان کے بنیادی مسائل کو حل کرتا ہے۔ یہی انسانیت کے دکھوں کا مداوا ہے۔ اور رہتی دنیا تک بس وہی ایک مداوا رہے گا۔

❁❁❁❁

سوال ﴿۳﴾ حیات طیبہ کے متعدد گوشے منظر عام پر آ جانے کے بعد آپ کی نگاہ میں کیا حیات طیبہ کا کوئی ایسا پہلو ہے جو ابھی تک پوشیدہ ہے۔

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک حسین مرقع ہے۔ ہر دور کے اہل نظر زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اس مرقع کی جلوہ نمائی کرتے رہے ہیں۔ اقدار زمانہ سے ذوق اور نقطۂ نظر میں فرق آتا رہتا ہے۔ اس لئے ہر دور میں جلوہ نمائی کا نیا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اردو زبان میں مندرجہ ذیل ترتیب سے سیرت رسول ﷺ پر کام ہوا ہے۔

۱۔ خصائص النبوۃ، ہشت بہشت، نطہ، میر باقر آگاہ دہلوری، ۱۸۰۲ کے بعد انتقال ہوا۔

۲۔ معجزات نبی، الکلام المبین فی آیات رحمۃ للعالمین، یہ مولانا عنایت احمد کاکوروی کی کتاب ہے جس میں ۲۵۲ معجزات کا تذکرہ ہے۔ طبع نظامی پریس ۳۷۰ء،

۳۔ سوانح حیات، سیرت النبی، از علامہ شبلی، تواریخ حبیب اللہ، از مولانا عنایت اللہ اینڈ مان، اصح السیر از مولانا عبدالروف دانا پوری وغیرہ۔

۴۔ سیاسی زندگی، از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، پیرس۔

۵۔ امامت مدینہ کا نظم ونسق، مطابت اشخا، الوثائق السیاسیہ (مکاتیب النبی)، از ڈاکٹر حمید اللہ پیرس۔

۶۔ عسکری زندگی، حدیث دفاع، از میجر جنرل محمد اکبر خاں،

۷۔ دعوتی زندگی، حیات طیبہ، از مولانا عبدالحئی رام پوری،

۸۔ محسنِ انسانیت، مولانا نعیم صدیقی

اب تک یہ چند پہلو نمایاں کئے جا سکے ہیں۔ ابھی بھی کتنے ہی پہلو ایسے ہیں جنہیں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً

۱۔ معاشرتی زندگی

۲۔ ازدواجی اور خانگی زندگی

۳۔ عبادتی زندگی

۴۔ معلّمی کی زندگی

۵۔ رحمۃ للعالمین، اصلاحِ افکارِ عالم و اصلاح معاشرتِ عالم وغیرہ۔

۶۔ ماخذ سیرت!

۷۔ جغرافیہ عرب، (پس منظر)

۸۔ شارع اور قانون ساز،

۹۔ اخلاق،

۱۰۔ برکات اسلام،

❁❁❁❁

سوال ﴿۴﴾ حضور اکرم ﷺ نے عرب کی سرزمین میں جو انقلاب برپا کیا تھا وہ آج بھی دنیا کے

تمام معاشروں اور تہذیبوں کے لئے یکساں مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

جواب: دنیا میں ہزاروں معاشرے قائم ہیں، لیکن ان سب میں ایک ہی انسان ہے۔ تہذیبوں کی نیرنگی بھی جداگانہ ہے، لیکن وہاں بھی انسان ایک ہی ہے۔ آج کا عام انسان اتنا ظاہر بیں ہوگیا ہے کہ مظاہرات کے اختلافات کو دیکھ کر وہ سمجھ بیٹھا ہے کہ سرے سے انسان ہی بدل گیا ہے۔ حالانکہ یہ اس کی خام خیالی ہے۔ اصلی انسان ہمیشہ ایک رہتا ہے۔ مظاہرات بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے جو تعلیم اصلی انسان کی تطہیر افکار اور تعمیر معاشرہ سے متعلق ہے، اور جو اقدار عالیہ کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔ وہ ہر دور میں اور ہر معاشرے میں یکساں رہتی ہے۔ اسلامی تعلیمات اور نمونۂ سنّت ہر دور کے انسان کے لئے ایک نعمت ہے۔

❁❁❁❁

سوال ﴿۵﴾ رسول خدا ﷺ نے ملت کا تصور جن اجزائے ترکیبی سے تیار کیا ہے۔ کیا وہ تصور پاکستانی تصور قومیت سے متصادم ہے؟

جواب: جاہلیت قدیم اور جدیدہ نے انسانی قومیت کا جو تصور دیا ہے وہ نسل، زبان، اور وطن وغیرہ کے اجزا سے مرکب ہے۔ ذرا سے غور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تصور میں خودغرضی اور خود پرستی کی جبلت کارفرما ہے۔ خودغرضی اور خود پرستی کا خاصہ یہ ہے کہ یہ اقوام اور افراد کے دلوں کو جوڑنے کے بجائے پھاڑتے ہیں۔ اتحاد کے بجائے افتراق، یک جہتی کی بجائے انتشار کی طرف مائل کرتے ہیں۔ جس معاشرے میں خودغرضی اور خود پرستی کو سب سے بڑا عامل قرار دیدیا جائے وہاں کوئی نظام بھی کامیابی سے نہیں چل سکتا ہے۔ کسی نظام حیات کو کامیابی سے چلنے کے لئے بے غرضی اور بے لوثی ورنہ کم از کم عدل و انصاف کے اصولوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ مگر یہ سب خودغرضی اور خود پرستی کی عین ضد ہے۔ اس لئے خالص قوم پرستی کی بنیاد پر اول تو کوئی معاشرہ قائم نہیں ہوسکتا ہے۔ اور اگر قائم ہو جائے تو دیرپا نہیں ہوسکتا ہے۔ وہ ضرور انتشار اور افتراق کی نذر ہو جائے گا۔

جس زمانے میں دنیا بے حد وسیع و عریض تھی۔ ایک قوم دوسری سے جدا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے بے الگ تھلگ زندگی گزار رہا تھا۔ اس وقت تو اس کوتاہ نظری سے گزران ہوسکتی تھی۔ آج جبکہ دنیا کی طنابیں کھینچ گئی ہیں۔ کرۂ ارضی ایک ملک اور معمورۂ ارضی ایک کنبہ معلوم ہوتا ہے۔ آج اس کوتاہ نظری سے گزران سخت دشوار ہے۔ آج کی دنیا کا تقاضا تو ان عوامل کو بروئے کار لانا ہے۔ جو قوموں کو جوڑنے والے

ہوں مربوط کرنے والے ہوں۔

اسلام انسانوں کے مابین مادی رشتوں کو ایک حد تک تسلیم کرتا ہے۔ مگر ان کو اتنی چھوٹ نہیں دیتا کہ وہ نوع انسانی کے درمیان پھوٹ ڈالیں۔ اسلام کے نزدیک انسان، حیوان سے اشرف و اعلیٰ ہے۔ عالمگیر آفاقی اصولوں کی بنا پر ان کو متحد کیا جا سکتا ہے۔ وہ حکم توحید ہے جس کو مضبوط تھامنے کے بعد دنیا جہان کے مسلمان ہزارہا اختلافات کے باوجود ایک ملت میں مربوط ہو جاتے ہیں۔ اسلامی قومیت عقیدہ توحید پر قائم ہے۔ اس کے بعد ہر مسلمان کے حقوق برابر ہیں۔ کالے گورے کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی۔ کلکم من آدم و آدم من تراب۔ او کما قال۔ (۵)

کسی عرب کو غیر عرب پر، یا غیر عرب کو عرب کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو۔ اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔

مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں کسی تفریق او راتیاز کو گوارا نہیں کیا۔ ہر ملک کے اہل علم کی قدر کی۔ مراکش کا ابن بطوطہ، دہلی میں آ کر قاضی القضاۃ (Chief Justice) بن گیا۔ شیخ محمد حیات سندھی نے حرم محترم مکہ معظمہ میں مسند تدریس سنبھال رکھی۔ صلاح الدین کردی نے مسلمانوں کی قیادت سنبھال کر بیت المقدس کو صلیبی عیسائیوں سے آزاد کرالیا۔ ابن تیمیہ کردی نے قرآن و سنت کی روشنی سے بدعات کے تمام خس و خاشاک کو صاف کر دیا۔ جس کی رہنمائی کو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک علما نے قبول کر لیا۔

پاکستانی قومیت اسلام کی عالمگیر آفاقی قومیت ہے۔ چند سر پھرے لوگ جاہلی قومیت کا پودا پاک سرزمین میں اگانا چاہتے ہیں۔ مگر انشاء اللہ وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔

❁❁❁❁

سوال ﴿۶﴾ کیا سنّت کے اتباع سے انسان ماضی کا غلام رہتا ہے۔ اور وہ عقلی بنیادوں پر آگے نہیں بڑھتا؟

جواب: یہ سوال جس ذہن سے نکلا ہے وہ انسان کا تصور ایک حیوان سے زیادہ نہیں رکھتا ہے۔

حیوان اپنی زندگی ایک دائرہ میں گزارتا ہے۔حیوان کا بچہ از سرِنو وہ زندگی شروع کرتا ہے۔جو باپ گزار چکا ہے، وہ کسی درجے میں بھی باپ کا رہین منت نہیں ہے۔لیکن اس نے کوئی تہذیب و تمدن برپا نہیں کیا۔اس کے یہاں کوئی ارتقا نہیں ہوا۔انسان نے عظیم الشان تہذیبیں قائم کی ہیں۔محیر العقول تمدن پیدا کئے ہیں۔ حیرت انگیز علوم ایجاد کئے ہیں۔یہ سب کچھ اگلوں کی محنت کی قدر کرتے ہوئے ان پر اضافہ کرنے کی بدولت ممکن ہوسکا ہے۔انسان ماضی سے بے نیاز ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ماضی کے تجربات ہی تو اس کے لئے مشعل راہ بنتے ہیں۔انسان نے جو بھی ترقی کی ہے وہ عقل وخرد کی رہنمائی تسلیم کرنے سے ہوئی ہے۔کوئی خبطی چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ عقل وخرد کی رہنمائی قبول کرنا ماضی کے عظیم انسانوں کی غلامی قبول کرنا ہے۔مگر کوئی بھی سلیم الذہن انسان ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتا ہے۔

نبی کی رہنمائی عقل وخرد کی رہنمائی سے افضل ہے۔دنیا کے تمام حکما اور فلاسفہ ظن وتخمین سے گفتگو کرتے ہیں۔ان کے افکار کی محسوسات پر بنیاد ہوتی ہے۔جس میں بہر حال غلطی کا امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔پھر ان کی نگاہ بھی محدود ہے،قبر سے ورے ورے ہی وہ دیکھ سکتے ہیں۔رسول ان کے عقائد میں عقل وخرد سے بالا وحی الٰہی سے مستفید ہوتا ہے۔جو ان حکما کو میسر نہیں۔یہ علم کا سب سے اعلیٰ ذریعہ ہے۔وہ بچشم عین ملکوت السموات والارض کا مشاہدہ کر چکا ہوتا ہے۔اس لئے وہ ایک دانا و بینا کی حیثیت سے ہدایت دیتا ہے۔اب یہ بات تو بے عقلی کی ہوگی کہ جو ہستی دانا و بینا ہو اس کو چھوڑ کر ظن وتخمین والوں کی باتوں کو مان لیا جائے۔وحی الٰہی کو چھوڑ کر قیاسات و اشاعات والوں کو قبول کرلیا جائے۔اس لئے انسان کی فلاح و کامیابی سنت کے اتباع میں ہے۔وہ عقل سے بھی اعلیٰ بنیاد ہے۔جو لوگ سنت کے اتباع کو غلامی قرار دیتے ہیں ان کا تصور انسان حیوان سے قریب تر ہے۔

❁❁❁❁

سوال ﴿۷﴾ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی تجربات سائنسی نظریات اور تصورات سے ٹکراتے ہیں؟

جواب: انسانی زندگی کے چار دوار ہیں، عالم جبلت وخواہشات، عالم رسوم ومعاشرت، عالم اخلاق اور عالم عبدیت، دو ادوار کا تعلق انسان کی حیوانیت سے اور دو کا تعلق انسان کی ملکوتیت سے ہے۔ سائنس کی زد زیادہ سے زیادہ اولین دو ادوار تک پڑ سکتی ہے۔لیکن آخری دو عالم تو اس کی دسترس سے باہر

ہیں۔اس لئے رسول اکرم ﷺ کے روحانی تجربات کا سائنس سے متصادم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔سائنس کا تعلق مادی دنیا سے ہے۔مادی دنیا کے تغیرات کی تفصیل وہ بیان کرسکتا ہے۔لیکن ان کی غرض و غایات کے جاننے سے بھی وہ عاجز ہے۔یہاں بھی رسول ﷺ کی تعلیمات ہی اس کی رہنمائی کرتی ہیں۔ سائنس کی تکمیل روحانی تعلیم میں ہے۔

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے

❁❁❁❁

سوال ﴿۸﴾ آج دنیا میں خصوصاً یورپ، افریقہ اور امریکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام کس اسلوب سے پہنچایا جائے۔

جواب: انسان آنکھ کے راستے ایمان لاتا ہے، کان کے راستے ایمان نہیں لاتا ہے۔تبلیغ دین کا سب سے اعلیٰ طریقہ تو وہ ہے جو خلافت راشدہ کے دور میں اختیار کیا گیا۔عرب میں اسلامی معاشرہ قائم ہوگیا۔اور لوگوں نے اپنی آنکھ سے اسلام کی برکتیں دیکھ لیں۔ان کے دلوں نے اس کی برتری کو قبول کرلیا اور پھر اس کو اپنے اپنے ملکوں میں نافذ کردیا۔دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر اسلام اسی طریقے پر نافذ ہوا ہے، سوشلزم آج روس اور چین میں قائم ہے۔اس لئے دنیا کے ہر ملک میں اس کے بہی خواہ موجود ہیں، اس لئے اگر کسی اسلامی ملک میں اسلامی نظام نافذ ہوجائے، اس کی تابناکیوں کا جلوہ دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، تو دنیا کے دوسرے ملکوں میں اس کا نافذ کرنا سہل ہوجائے گا۔

دوسرے نمبر پر صوفیا کرام کا طریقہ کار ہے۔غیر مسلم علاقوں میں ایسے مسلمان مبلغ بھیجے جائیں جو خود پورے اسلام پر عمل پیرا ہوں، جو مخلص اور بے لوث ہوں۔جن کی پاکیزہ زندگیاں دیکھ کر اللہ یاد آجائے۔حسن عمل میں بھی مقناطیس سے کچھ کم کشش نہیں ہوتی ہے۔آج کے زمانے میں افکار کی جنگ برپا ہے۔اس لئے ایسے مبلغوں کو مغربی فلسفہ کا توڑ اور اسلامی احکام کی صداقت پر پختہ یقین ہونا چاہئے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

❁❁❁❁

سوال ﴿۹﴾ مستشرقین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر خاصا کام کیا ہے۔کیا آپ اس

کام میں خلوص اور دیانت پاتے ہیں۔

جواب: قطع نظر اس کے کہ وہ متعصب ہے یا آزاد خیال ہر مغربی بچہ بچپن سے اسلام کے خلاف شدید قسم کا تعصب ہضم کر کے آگے بڑھتا ہے۔ جو اس کے دل و دماغ میں رچ بس جاتا ہے۔ وہ انصاف کی بات بھی بہت کم کرتے ہیں۔ ایک مومن مسلمان کی تو نگاہ ہی اور ہوتی ہے۔

مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

(اقبال)

ان کا بہترین مصنف جو کچھ اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک اچھے انسان تھے۔ آپ کا نظام ساتویں صدی عیسوی میں ایک اچھا طریقہ کار تھا۔ وہ ہرگز یہ بات نہیں مان سکتا ہے کہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول انسانیت ہیں۔ آپ کا دین رہتی دنیا تک کے لئے بہترین نظام حیات ہے۔ وہ اس کو عالمگیر اور ابدی نظام ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہے۔ یہاں ایک کافر اور ایک مومن کا نقطہ نظر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

آدمی دیدست باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

(رومی)

❁❁❁❁

سوال ﴿۱۰﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے جو اقتصادی ڈھانچہ سامنے آتا ہے کیا وہ ہمیں موجودہ معاشی بحران سے نجات دلا سکتا ہے۔

جواب: اس کا جواب تو ضرور اثبات میں ہے۔ مگر اس کی تشریح کے لئے جداگانہ دفتر درکار ہے۔

❁❁❁❁

سوال ﴿۱۱﴾ دنیا کے انقلابی رہنماؤں نے نوجوانوں کو متاثر کر کے اپنا مشن پایہ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ آپ کے خیال میں ہمارے نوجوانوں کو سیرت طیبہ کا مطالعہ کن خطوط پر کرنا چاہئے کہ ان میں عقل و عشق کا امتزاج پیدا ہو۔

جواب: آج کا نوجوان بے یقینی کا مریض ہے۔اس کی نگاہ یرقان زدہ ہے۔ہوا و ہوس کے خارزاروں میں الجھا ہوا ہے۔سب سے پہلے اس کے دل سے شکوک وشبہات کے کانٹے نکالئے،اس کی نگاہ کا انداز بدلئے۔جن اعاظم رجال کا وہ پرستار بنا ہوا ہے۔ان کی حقیقت سے باخبر کیجئے۔اس کے بعد جمال محمدی ﷺ کی جلوہ نمائی کیجئے۔پھر دیکھئے کہ کس طرح وہ اس چشمہ آب حیات پر ٹوٹ کر گرتا ہے۔

جس نے دیکھا وہیں پھر کھڑا رہ گیا
کس غضب کی کشش ہے تری زلف میں

دنیا کے تمام حکماو فلاسفہ اور اعاظم رجال ناقص اور یک رخے ہیں۔ان کی تمام تر گفتگو ظن وتخمین سے ہوتی ہے۔وہ اپنے بتائے ہوئے معیار پر خود بھی پورے نہیں اترتے ہیں،ارسطو الٰہیات میں افلاک سے تارے توڑ کر لاتا ہے،لیکن وہ بیویوں کا شوہر ہونے کے باوجود عورت کے منہ میں ۲۸ دانت بتاتا ہے۔جس پر آج کا ایک بچہ بھی ہنستے۔روسو جدید تعلیم کا معمار اعظم کہلاتا ہے،اس نے اپنی اولاد کو لاوارث بتا کر یتیم خانہ میں داخل کرا دیا تھا۔تاکہ اس کے عیش میں خلل نہ واقع ہو۔یہ گرا ہوا انسان جدید یورپ کا معلم ہے۔

افضل ترین انسان کے لئے جو معیار اور کسوٹی دنیا نے تجویز کی ہے اس پر صرف ایک ہستی ہے جو پوری اترسکتی ہے۔کوئی دوسری ہستی اس معیار پر پوری نہیں اترسکتی ہے۔وہ ذات گرامی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم فداہ امی وابی کی ہے۔

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام آقا چیزے دیگری
حسن یوسف، دم عیسی، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

صحیح تناظر میں سیرت الرسول کو پیش کیجئے۔اور پھر اس کی مقناطیسی کشش دیکھئے۔

حوالہ جات

۱۔ سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۹،

۲۔ سورۂ قلم، آیت ۴،

۳۔ سورۂ احزاب، آیت ۲۱،

۴۔ سورۂ انبیا، آیت ۱۰۷،

۵۔ خطبہ حجۃ الوداع، سیرت ابن ہشام، بیروت، ج ۴، سیرت ابن کثیر، بیروت ج ۴،

ماہنامہ **مسیحائی**

کا

خلفائے راشدین نمبر زیر ادارت

مخدوم زادہ احمد خیر الدین انصاری

عنقریب آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے

رابطہ کیجئے :فون نمبر ۰۳۰۳۔۷۲۳۴۸۹۹

رسول اللہ ﷺ بحیثیت حکیم و مدبر

یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ ہے کہ آپ کی سیرت پاک پر لکھنے والوں کا ایک طویل سلسلہ اول روز سے قائم ہے اور آج تک قائم و دائم ہے۔ کبھی بھی تسلسل میں فرق نہیں آیا۔ عربی کے علاوہ دنیا کی ہر بڑی زبان میں سیرت پر کتابیں موجود ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلمانوں نے بھی کثرت سے سیرت پر کتابیں لکھیں۔ دنیا میں کسی دوسرے فرد کو اتنے کثیر سوانح نگار نہیں ملے۔ یہ بھی ورفعنا لک ذکرک کی ایک تفسیر ہے۔ ان سوانحی کتب میں بعض امور تو بالکل نمایاں ہو گئے ہیں لیکن بعض دوسرے اہم امور دب گئے ہیں۔ اس لئے آج کی صحبت میں ہم سیرت طیبہ کے ایک پہلو ''بحیثیت حکیم و مدبر'' پر روشنی ڈالیں گے۔

مدبر اور حکیم کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جو شخص اپنے مقصود اور مطلوب کو حاصل کرنے کے لئے موزوں اور مناسب اسباب و ذرائع اور وسائل فراہم کرے۔ پھر ان کو بروقت اور صحیح طریقے سے استعمال کرے۔ موانعات اور مزاحمتوں کو تدابیر سے رفع کرے کم سے کم طاقت اور قوت کا استعمال کرے۔ اس طرح سے کم سے کم مدت میں اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے، اپنا مطلوب اور مراد حاصل کر لے، اور پھر اپنے پیچھے ایسے مخلص جاں نثاروں کا گروہ چھوڑ کر جائے جو ان مقاصد کے حصول میں سر دھڑ کی بازی لگا دیں، جو ان مقاصد کو چار دانگ عالم میں غالب اور کارفرما بنا دیں۔ حتیٰ کہ رہتی دنیا تک پھر ان مقاصد کا ڈنکا بجتا رہے۔ ایسے رہبر اور رہنما اور ایسے مدبر اور حکیم کی کامیابی اور فائز المرامی میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ بس وہی حقیقی ہادی ہے اور وہی حقیقی قائد ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیمات دنیا میں رائج کرنا چاہتے تھے، جو دین دنیا میں پھیلانا چاہتے تھے۔ اس کی بنیاد اور اس کا مرکزی نقطہ توحید کی تعلیم ہے۔ آج چودہ سو سال کی مدت گزر جانے کے

بعد منطقی اور کلامی بحثوں کے نتیجے میں جب ہمارے سامنے توحید کا لفظ بولا جاتا ہے تو ذہن فوراً منطقی بحثوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ توحید فی الذات، توحید فی الصفات اور توحید فی العبادات کے الفاظ دماغوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ لیکن جن قریشیوں اور جن عربوں کے سامنے سب سے اول یہ تعلیم پیش کی گئی تھی، وہ نہ منطقی تھے اور نہ فلسفی تھے، وہ سیدھے سادے انسان تھے۔ انہوں نے کلمہ لا الہ الا اللہ کا مفہوم وہی سمجھا جو ان کے ذہن میں بغیر تکلیف اور بغیر تکلف کے آیا۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ کلمہ ہم کو دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت ترک کر دیں۔ اپنے سرداروں، اپنے مذہبی پیشواؤں اور اپنے سیاسی حاکموں کی بات ماننا چھوڑ دیں۔ بس صرف ایک اللہ کی بات مانیں۔ اسی کے مطیع و فرماں بردار بن کر رہیں۔

بِرَبِّ النَّاسِ O مَلِکِ النَّاسِ O اِلٰہِ النَّاسِ O (۱)

سے یہی بات ان کے ذہن میں آتی تھی۔ جو کچھ انہوں نے سمجھا وہ بالکل درست تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کو جو خط لکھا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے۔

اما بعد! فانی ادعوکم الی عبادۃ اللّٰہ من عبادۃ العباد، وادعوکم الی ولایت اللّٰہ من ولایت العباد۔ (۲)

میں تم کو انسانوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ میں تم کو انسانوں کی ولایت (حمایت و نصرت) سے نکال کر خدا کی ولایت میں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔

اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کا مشن انسانوں کو انسانوں کی اطاعت و فرماں روائی سے نکالنا تھا۔ اور اس کی جگہ صرف خدائے واحد کی حاکمیت اور عبادت کا نظام قائم کرنا تھا۔

اس دور کے عام انسان بھی عبادت کا یہی مفہوم سمجھتے تھے۔ قادسیہ کی جنگ سن ۱۴ ہجری میں واقع ہوئی ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتقال کئے ہوئے صرف تین سال گزرے تھے۔ اس جنگ میں ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں صحابی رسول ربعی بن عامرؓ نے اسلام کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

..... **فقالوا لہ ماجاء بکم فقال، اللّٰہ ابتعثنا، لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللّٰہ، ومن ضیق الدنیا الی سعتھا، ومن**

جور الادیان الی عدل الاسلام، فارسلنا بدینہ الی خلقہ لندعوھم الیہ۔ (۳)

رستم: تم یہاں کیوں آئے ہو؟

ربعیؓ: اللہ نے ہمیں بھیجا ہے تا کہ ہمارے ذریعہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے بندوں کی عبادت سے نکالے اور اللہ کی عبادت میں لے آئے، جس کو چاہے دنیا کی تنگی سے نکالے اور وسیع دنیا میں لے آئے۔ مذاہب کے جور ستم سے نکال کر اسلام کے عدل و انصاف میں لے آئے۔ اس نے ہم کو اپنا دین دے کر اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے۔ تا کہ ہم مخلوق کو اس کی طرف بلائیں۔

ان الفاظ پر غور کیجئے، لا الہ الا اللہ ایک انقلابی دعوت تھی۔ صحابہ کرامؓ اس انقلابی دعوت سے سرشار تھے۔ وہ اس دعوت کو ساری دنیا میں پھیلانے کے لئے سرگرم عمل تھے۔ جو نادان لوگ ان پر جہاں گیری اور شاہنشاہیت کا الزام لگاتے ہیں وہ کتنے ناواقف ہیں، اور کس قدر غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

جس توحید کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں قریشیوں کو دے رہے تھے وہ ایک انقلابی دعوت تھی۔ اہل قریش اچھی طرح سے جانتے تھے کہ اس دعوت کی زد ہمارے بتوں پر پڑتی ہے۔ ہمارے مذہبی رہنماؤں پر پڑتی ہے۔ ہمارے قبائلی سرداروں پر پڑتی ہے، ہمارے رسوم و رواج پر پڑتی ہے۔ ہمارے کاروبار اور تجارت پر پڑتی ہے۔ ہماری ساری انفرادی اور معاشرتی زندگی پر پڑتی ہے۔ ممکن ہے بعض سادہ لوح اعراب اس انقلابی دعوت کا مفہوم اتنی گہرائی میں نہ سمجھتے ہوں، مگر ان کے مذہبی اور قبائلی سردار خوب خوب سمجھتے تھے کہ اس دعوت کے بعد ان کی بالادستی ختم ہو جائے گی۔ یہ بالادستی اور استحصال کا معاشرتی نظام ختم ہو جائے گا، انہوں نے سادہ لوح اعراب کو بھی اصل حقیقت سمجھادی تھی اور ان کو نئے دین کے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ صف آرا کر دیا تھا۔

ہم مسلمان اسلام میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے بت پرستی کا صحیح مطلب نہیں سمجھتے۔ اس کی قوت اور اس کی گرفت کا ہمیں صحیح طور پر اندازہ نہیں ہے۔ مکہ کے بت پرست ماحول میں اس نظام کی گرفت انسانوں کے دلوں اور دماغوں پر جس قدر تھی اس کا ہمیں صحیح ادراک نہیں ہے۔

مٹی، پتھر، سونے چاندی کا ایک مجسمہ ایک بت ہوتا ہے۔ یہ تو اس کا ظاہری اور مرئی حصہ ہے۔ اس کے پس پردہ ایک غیر مرئی داستان ہوتی ہے۔ اس میں اس کے حسن وعشق کے قصے بیان کئے جاتے

ہیں۔اس کی طاقت اور قوت کی داستانیں ہوتی ہیں۔اس کے غصے، جلال اور قہر مانی کے واقعات ہوتے ہیں۔ساتھ ہی اس کی محبت و شفقت کے واقعات ہوتے ہیں۔اس کی جود و عطا و بخشش کی داستانیں ہوتی ہیں۔وہ ہمہ صفت موصوف اور ہمہ قوت متصف ہوتا ہے۔گھڑی میں ناراض ہو تو بھسم کر ڈالے۔اور گھڑی میں اگر خوش ہو تو نہال کر دے، باغ و بہار کر دے۔اس کی ساری قوتیں اور طاقتیں غیر مرئی ہیں مخفی ہیں۔ انسانوں کی دسترس سے باہر ہیں ان داستانوں کو سن کر ایک انسان کو اپنی بے بسی اور بے کسی کا شعور ہوتا ہے۔ وہ اس بت سے رحم و کرم کا امیدوار رہتا ہے۔بتوں کی عبادت کا طریقہ بڑا پیچیدہ بنایا جاتا ہے۔جزئیات اور تفصیلات میں انتہائی زور ہوتا ہے۔ایک معتقد عبادت کے طریقے سے گزرتا ہے تو اس کے ذہن اور نفس پر بت کی عظمت اور طاقت کا سکہ جم جاتا ہے۔سالوں اس طرح عبادت کرنے سے اپنی بے کسی اور بت کی عظمت ذہنوں میں راسخ ہو جاتی ہے۔صدیوں سے جہاں بت پرستی رائج ہے وہاں ساری قوم پوری طرح عظمت کی قائل اور ماننے والی بن جاتی ہے۔

مذہبی گروہ، مذہبی پیشوا، پروہت یا پادری اس بت کے مقرب ہونے کے سبب عظمت کے مالک ہو جاتے ہیں۔وہ اس بت کے متکلم (Spoken man) بن جاتے ہیں۔وہ جو کہدیں وہ حق ہے اور حرف آخر ہے۔اس کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہوتا، ساری بت پرستانہ شریعت زبانی احکام پر چلتی ہے۔ان کی دینی پیشوائی درحقیقت بڑی مستحکم حاکمیت اور حکومت ہوتی ہے۔دنیاوی سردار اور بادشاہ بھی بت پر چڑھاوا چڑھا کر، سونے کا بت بنا کر، مندر بنا کر، دروازہ چڑھا کر، یا کسی طریقے سے اس کی خدمت کر کے وہ بھی اس کی عظمت میں شریک ہو جانا چاہتے ہیں۔اس طرح وہ بھی عوام پر اپنا حکم اقتدار مستحکم کرتے ہیں۔

اس پورے نظام بت پرستی پر جو شخص بھی سنجیدگی سے غور کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ انسانوں کو غلام بنانے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا۔اگلے زمانے میں تو بت پرستی ہی واحد طریقہ تھا۔آج کل علم و فن کی ترقی کے ساتھ ذہنوں کو غلام بنانے میں پریس و پروپاگنڈا، ریڈیو، اور ٹی وی بھی بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔یہ خالی از علت بات نہیں تھی کہ اسٹالن نے حکم دیدیا تھا کہ ہر کاشت کار اپنے کھیت میں ہر دفتر میں میری تصویر لگائے، ماؤ نے حکم دیدیا تھا کہ صبح اٹھتے ہی میری لال کتاب کی تلاوت کیا کرو۔ پاکستان کے ایک وزیر کا وطیرہ تھا کہ صبح اٹھتے ہی اخبارات میں یہ دیکھتا تھا کہ میری تصویر چھپی ہے یا نہیں۔ اور چھپی ہے تو کہاں چھپی ہے۔مگر جدید طریقوں کے مقابلے میں غلام بنانے کا ذہنوں کو ماؤف اور مسحور

کرنے کا سب سے بہتر طریقہ بت پرستی ہے۔ وہ کتنا بڑا زیرک اور کتنا بڑا شاطر انسان ہوگا جس نے دلوں کو غلام بنانے کا یہ طریقہ ایجاد کیا تھا۔

اس بت پرستی کو اس غلامانہ ذہنیت سازی کے ادارے کو وہ مصلح اعظم کیسے برداشت کرسکتا تھا جو انسانوں کو ساری انسانیت کو انسانوں کی اور ہر باطل کی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے آیا تھا۔ اس نے پوری قوت سے لا الہ الا اللہ کا نعرہ بلند کیا۔ یہ نعرہ ہر قسم کی غلامی کے لئے موت کا حکم ہے۔ یہ نعرہ انسانوں کی آزادی کا پروانہ ہے۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا فیضان ہے۔ کہ مسلمان ان ساری خرافات سے پاک ہیں۔

نے خدایا سا ختیم از گاؤ خر
نے حضور کاہناں افگندہ سر
نے سجودے پیش معبودان پیر
نے طواف کوشک سلطان و میر
ایں ہمہ از لطف بے پایان تستؐ
فکر ما پروردۂ احسان تستؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بت پرستی کے خلاف وہ شاہ ضرب لگائی، وہ انقلابی نعرہ بلند کیا کہ جو اقوام بت شکنی کر کے مسلمان ہوگئیں وہ تو دائرہ توحید میں آ گئیں۔ لیکن جو مسلمان نہ ہوئیں وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ از خود ان کے اندر توحید کی اصل کو ڈھونڈ کر نکالا جانے لگا۔ بت پرستوں کا موقف اب مدافعانہ ہوگیا بت پرستی کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔

حوالہ جات

۱۔ سورۂ الناس، آیت ۲،
۲۔ ڈاکٹر حمید اللہ/ الوثائق السیاسیہ/ طبعہ فاخرہ/ ص ۱۷۵، وثیقہ ۹۳ء،
۳۔ ابن کثیر/ البدایۃ والنہایہ/ بیروت/ ج ۷، ص ۴۶،

مکے میں دعوت حق کا ظہور

۱۔ مکے کے ایک خاموش اور شریف ترین انسان کو رحمت خداوندی نے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے منتخب کرلیا۔ اس پر وحی نازل ہوئی۔

اے چادر لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور (لوگوں کو اعمال کی پاداش) سے ڈراؤ۔ (۱)

ایک دوسری وحی میں فرمایا گیا،

اِنَّا سَنُلْقِی عَلَیْکَ قَوْلاً ثَقِیْلاً ○ (۲)

ہم تم پر ایک بھاری بوجھ ڈالنے والے ہیں۔

اس خاموش انسان کو پہلے مکے اور عرب کی ہدایت کے لئے اور پھر ساری دنیا کی ہدایت کے لئے منتخب کرلیا گیا۔ اس خاموش انسان پر بہت بڑا بوجھ ڈال دیا گیا۔ بہت بڑی ذمہ داری عائد کردی گئی۔

۲۔ مکہ بت پرستی کا مرکزی مقام تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک تجارتی مرکز بھی تھا۔ بت پرست اور مادہ پرست ماحول میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حق پرستی کا آغاز کیا اور توحید کا نعرہ بلند کیا۔ آپ نے دعوت دی۔

اے لوگو! (دل کے یقین کے ساتھ) کہو، اللہ کے علاوہ کوئی حاکم کوئی معبود نہیں ہے،

اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ تب تم فلاح پاؤ گے۔ (۳)

آپ ﷺ نے خاموشی کے ساتھ دین حق کی دعوت کا آغاز کردیا۔ سعید روحیں اس دعوت کو قبول کرنے لگیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شخص جتنا قریب تھا اسی قدر جلدی وہ نئے دین میں شامل ہوگیا۔ معاشرے کے خوشحال اور صاحب علم افراد کے مقابلے میں معاشرے کے کمزور اور پسے ہوئے لوگوں نے مردوں میں سے بھی اور عورتوں میں سے بھی سبقت کی۔

۳۔ مکے کے صاحب اقتدار لوگوں نے اپنے نظام معاشرت و معیشت کے خلاف اس نئی آواز کا سختی

سے نوش لیا۔انہوں نے اس نئی دعوت کو قوت و طاقت سے دبانے کی کوشش کی ۔ جو لوگ اس دعوت پر ایمان لائے تھے، نومسلم تھے، غلاموں اور لونڈیوں سے تعلق رکھتے تھے، وہ ان کے ظلم و ستم کا شکار رہے ۔مگر ظلم و ستم کے باوجود دعوت کو قبول کرنے والوں میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ظلم و ستم کی بھٹی میں پڑ کر ان کا میل کچیل دور ہو گیا ۔وہ نکھر کر خالص کندن بن گئے ۔ یہ لوگ نوع انسانی کا گل سرسبز تھے ۔یہ لوگ انسانیت کا نمک تھے ۔

۴۔ دوسری جانب داعی نے ان نومسلموں کی فکری اور عملی تعلیم و تربیت کا انتظام فرمایا ۔دار ارقم میں ایک خفیہ مدرسہ قائم ہو گیا ۔جہاں نومسلم نظریں بچا کر آتے تھے اور تعلیم حاصل کرتے تھے ۔داعی کی تعلیم و تربیت اور صاحبان اقتدار کا ظلم و ستم دونوں برابر جاری رہے ۔دونوں سے فکر و عمل میں نکھار آتا رہا۔

۵۔ چار سال کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں بلاشبہ دعوت حق کے قبول کرنے والوں میں تو اضافہ ہوتا رہا لیکن بحیثیت مجموعی مکے کے معاشرے نے دعوت حق کو قبول نہیں کیا۔عرب کا واحد مرکزی شہر مکہ تھا۔مکہ اگر دعوت حق کو قبول کر لیتا تو بڑی جلدی سارے عرب میں دعوت حق پھیل جاتی ۔داعی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اب مکے سے باہر نظریں ڈالنا شروع کیں ۔قریب میں حبشہ ایک مسیحی ملک تھا۔انبیاؑ کی دعوت سے بیگانہ نہیں تھا ۔آپ ﷺ نے سنجیدہ مسلمانوں پر مشتمل ایک وفد وہاں بھیجا۔

وہاں جا کر معلوم ہوا کہ حکمران اگرچہ دعوت حق کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے، مگر وہ کمزور طبیعت کا آدمی ہے ۔پادریوں کی مخالفت کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا ۔اس لئے یہ مہم ناکام ہوئی ۔

طائف مکے کے قریب امرا کا گرمائی مستقر تھا۔اس کو بھی کسی درجے میں اہمیت حاصل تھی ۔کچھ عرصے کے بعد آپ وہاں تشریف لے گئے مگر وہ ایسے خودسر لوگ تھے کہ وہ دعوت کو سننے پر بھی آمادہ نہیں ہوئے ۔وہاں سے بھی آپ ناکام لوٹے ۔

۶۔ اس مایوسی اور نامرادی کے عالم میں امید کی کرن پھوٹی ۔مدینہ سے حاجیوں کا ایک قافلہ معمول کے مطابق حج کرنے کے لئے مکے میں آیا ۔یہاں انہوں نے دعوت حق سنی ۔یہودیوں کی ہم سائگی کی وجہ سے وہ انبیاؑ کی دعوت سے قدرے مانوس تھے ۔انہوں نے دعوت حق کو قبول کر لیا۔ مدینہ دعوت حق کا مرکز بن گیا ۔ مکے سے مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچنے لگے ۔سب سے آخر میں

تحریک اسلامی کے قائد نے مکہ سے ہجرت اختیار کی۔

۷۔ مدینہ منتشر گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ جس میں عرب اور یہودی آباد تھے۔ اب مکے سے ہجرت کر کے مسلمان مہاجرین بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس لئے اس شہر کی تنظیم ضروری تھی۔ مدینہ کے مسلمانوں نے تو مکے میں جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرماں برداری قبول کرلی تھی۔ یہودیوں نے بھی باقاعدہ معاہدہ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حاکمیت اور بالادستی قبول کرلی (میثاق مدینہ) اس لئے مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک نبی کی اور ایک خودمختار حاکم اعلیٰ کی تھی۔ مکے کا دور مقہوری ختم ہوگیا اور مدینے کا دور آزادی شروع ہوگیا۔ مہاجر مسلمان (مکی) اور انصار مسلمان (مدنی) کو مواخاۃ کے ذریعے باہم شیر و شکر کر دیا۔ اس طرح مدینہ منورہ اسلام کا مرکزی شہر بن گیا۔ جس کی آبادی باہم متحد اور منظم تھی۔

۸۔ تین سو میل دور دین حق کی یہ چھوٹی سی بستی مکے کے صاحبان اقتدار کی نگاہ میں خار کی طرح کھٹکنے لگی۔ انہوں نے اس کے خاتمے کا تہیہ کرلیا۔ دوسرے سال اہل مکہ ایک بڑے لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوگئے۔ بدر کے میدان میں فریقین کا مقابلہ ہوا۔ اور اہل مکہ نے بری طرح شکست کھائی۔ آئندہ سال وہ پھر حملہ آور ہوئے اس مرتبہ جنگ کا نتیجہ زیادہ واضح نہیں نکلا۔ (جنگ احد) عظیم تیاری کے بعد وہ چوتھے سال پھر حملہ آور ہوئے۔ اور اہل مدینہ کو اپنے دفاع کے لئے خندق کھودنا پڑی۔

۹۔ ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے ساتھ حج کرنے کے لئے مکے کی جانب روانہ ہوگئے، اس سے اہل مکہ عجب مخمصے میں پڑ گئے۔ ایک طرف تو ہزاروں سال کی روایت کہ حج کے لئے کسی کو نہیں روک سکتے۔ دوسری طرف اہل مکہ اہل مدینہ سے حالت جنگ میں تھے۔ دشمن کو وہ اپنے شہر میں کیسے آنے دیں۔ بالآخر فریقین کے درمیان صلح نامہ حدیبیہ طے پایا۔ جس میں فریقین کے درمیان دس سال کے لئے حالت امن کا اعلان ہوا۔ اور یہ کہ مسلمان عمرہ آئندہ سال ادا کریں۔

۱۰۔ صلح حدیبیا اسلام کی تاریخ کا اہم موڑ ہے۔ حالت امن سے اسلامی تحریک کو فائدہ پہنچا۔ مدینے کے شمال میں خیبر کے یہودی تھے اور جنوب میں مکے کے مشرک تھے۔ اور ان لوگوں کے مابین گٹھ جوڑ تھا۔ جس کی وجہ سے چھ سال تک مدینہ میں خوف و ہراس کا عالم طاری رہا۔ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کو ان کی غداری کا مزا چکھا دیا۔ خیبر فتح

کرلیا۔اہل مکہ کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔حالت امن سے مکہ اور مدینے کے درمیان باہم ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔اہل مدینہ کی دینی اور اخلاقی حالت سے کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔اس زمانے میں خالد بن ولید اور عمرو بن العاصؓ جیسے تجربہ کار جنگی کی ماہرین دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔مشرکین مکہ کے اندر ٹوٹ پھوٹ بڑھ گئی۔بالآخر ہجرت کے آٹھ سال بعد معاہدہ کی خلاف ورزی کرکے موقع فراہم کر دیا اور مدینہ کا اسلامی لشکر مکہ میں فاتحانہ داخل ہوگیا، مشرکین مکہ کے غرور کا سر نیچا ہوگیا۔عرب کا مرکزی مقام زیر ہوگیا۔عرب کے دوسرے تمام قبائل اہل مکہ اور اہل مدینہ کی اس آویزش میں تماشہ دیکھ رہے تھے، جب مدینہ کی اسلامی ریاست کو مکمل فتح حاصل ہوگئی تو وہ سب جیتنے والے فریق کے ساتھ آملے، اور فوج در فوج لوگ دین اسلام میں داخل ہوگئے۔

۱۰۔ مدینہ کی دس سال کی زندگی میں پوری طرح اسلامی معاشرہ سرگرم عمل ہوگیا۔معیشت، معاشرت، سیاست، اخلاق، قانون تمام شعبے پوری طرح کام کرنے لگے، اس لئے کچھ عرصے بعد اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وحی نازل فرمائی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً ح (۴)

آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا۔تم پر نعمتوں کا اتمام کر دیا اور دین اسلام کو تمہارے لئے پسند کرلیا۔

اللہ تعالیٰ نے پروانۂ خوشنودی عطا فرمادیا۔

حوالہ جات

۱۔ سورۂ مدثر، آیت ۱۔۲، ۲۔ سورۂ مزمل آیت ۵،

۳۔ مسند احمد، بیروت، ج۴، رقم ۱۵۵۹۳، ۴۔ سورۂ مائدہ آیت ۳،